20

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا

اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں نہ پڑو

حبل اللّٰہ

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي
النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝

خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل گیا ہے
تاکہ اللہ اُن کو اُن کے کچھ اعمال کا مزہ چکھائے تاکہ وہ پلٹ آئیں۔

(الروم : ۴۱)

الہامی ادب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یٰاَیُّھَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ ؕ اِنَّ
الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا
وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَہٗ ؕ وَاِنْ یَّسْلُبْھُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا
لَّا یَسْتَنْقِذُوْہُ مِنْہُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝
مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝

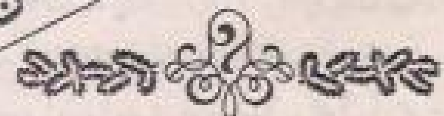
لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے۔ اسے غور سے سنو۔ جن کو تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے چاہے سب کے سب جمع ہو جائیں۔ اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے۔ مدد چاہنے والے بھی کمزور اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور۔ ان لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہ جانی جیسا کہ اسکا حق ہے۔ بلاشبہ قوت اور عزت والا تو اللہ ہی ہے۔ (الحج: ۷۳-۷۴)

مجلہ نمبر ۲۰ — جولائی ۱۹۹۹ء

حبل اللہ

مدیر	محمد اعظم خان
نائب مدیر	انیس الدین

معاونین
محمدی گل
یعقوب علی
سعید احمد
طارق نسیم
منور سلطان



تحریکی ساتھیوں سے اپیل
تحریک کو جاری رکھنے
اور حبل اللہ کی اشاعت کو ممکن
بنانے کے لئے حسب توفیق مالی تعاون
ضرور فرمائیے

یہ مجلہ بلا قیمت تقسیم کیا جاتا ہے

مقام اشاعت

مرکزی دفتر۔ مسجد توحید
آر۔ جی ریلوے کوارٹرز، پوسٹ بکس نمبر ۵۲۸۰
کیماڑی۔ کراچی

اس شمارے میں

ترتیب

حدیثِ دل

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ تین ایسی صفات ہیں کہ وہ جس کسی میں ہوں گی وہ ایمان کی حلاوت پالے گا:

(۱) کہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت ان کے سوا ہر ایک سے زیادہ ہو؛

(۲) وہ جس کسی سے محبت کرے صرف اللہ ہی (کی رضا) کے لئے کرے (کسی اور غرض سے نہیں)؛

(۳) وہ کفر کی طرف لوٹنے کو، جبکہ اللہ نے اسے اس سے بچالیا، ایسا ہی ناپسند کرے جیسے آگ میں ڈالے جانے کو ناپسند کرتا ہے۔

(صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب من کرہ ان یعود فی الکفر ---)

اس مختصر مگر جامع حدیث میں مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک بڑی فکر انگیز خبر دی ہے اور فی الحقیقت ایمان کو پرکھنے کے لئے کسوٹی فراہم کردی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایمان کے دعویدار اپنے ایمان کو اس معیار پر پرکھیں، اگر جواب اثبات میں ہو تو ان کے لئے خوشخبری ہے کہ وہ ایمان کی حقیقی لذت سے آشنا ہیں، ورنہ ان کے لئے لمحۂ فکریہ ہے کہ کہیں وہ لذتِ ایمان سے محروم تو نہیں بصورتِ دیگر ان کا ایمان گویا ایمان ہی نہیں، روح سے خالی محض لفظی اقرار ہے جس کے ان پر حقیقی اثرات مرتب ہو ہی نہیں سکتے۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے زبانی اقرار پر آخرت میں اپنے جیسوں کی صف میں تو کھڑے ہو جائیں، لیکن یہ لوگ ان مبارک نفوس کی طرح ہرگز نہیں ہو سکتے جو دوسروں کے لئے نمونہ ہے، جنہوں نے دنیا میں ایک انقلاب برپا کیا، باطل کے ایوانوں کو لرزا دیا اور بالآخر رنگِ جہاں بدل ڈالا!

جب کسی سے محبت ایسی ہو کہ اسے ماسوا سے زیادہ قرار دے دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پھر وہی مطاع اور "آئیڈیل" ہو اور کائنات میں کوئی دوسری شے یا شخصیت ایسی نہ ہو جس کو اس کے برابر کھڑا کیا جائے، اس کی طرف ذرا بھی ایسا میلان نہ ہو کہ اس کے قول و فعل کو آئیڈیل کے مقابلے میں قابلِ ترجیح سمجھا جائے۔ بلکہ اس (آئیڈیل) سے ایسا گہرا تعلق اور وابستگی ہو کہ اس کی زندگی کے ایک ایک گوشے کو قابلِ اتباع سمجھتے ہوئے اپنے شب و روز اور زندگی کے تمام معاملات، کردار، گفتار، چال ڈھال وغیرہ کو اسی کے رنگ میں رنگ لیا جائے، اس سے محبت و عقیدت کا یہ حال ہو کہ اس کے آگے سب ہیچ نظر آنے لگے، اس کے قول و فعل پر جان دینے کو ہر وقت تیار ہوں، اس کے فرمان پر سر قربان ہو اور اس کے حکم کی تعمیل کے لئے دل و جان اور پوری مستعدی و شوق سے ہر وقت تیار رہیں۔ اللہ کے رسول سے محبت دراصل اسی معیار کی متقاضی ہے اور یہ عین تقاضائے ایمان ہے۔ لیکن یہ پہلو بھی ذہن نشین رہے کہ مخلوق کی محبت میں ایسا غلو نہ ہو کہ اس کو خالق کا درجہ دے دیا جائے۔ جب خالق کے مقابلے میں مخلوق سے ایسی محبت ہو جائے تو یہ بلاشبہ صریح گمراہی اور کفر و شرک ہے۔ قرآن نے مومن و مشرک کی محبت کا موازنہ پیش کیا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ (البقرۃ:۱۶۵)

"اور بعض لوگ ایسے ہیں جو دوسروں کو اللہ کا ہمسر بناتے ہیں اور ان سے اللہ کی سی محبت کرتے ہیں۔ لیکن جو ایمان والے ہیں وہ تو اللہ ہی سے شدید محبت کرتے ہیں۔"

یہاں اس بات پر زور دیا جارہا ہے کہ خالق و مخلوق کی محبت میں فرق و امتیاز لازم رکھا جائے۔ خالق سے محبت و عقیدت کا تقاضا اس کی عبادت ہے جبکہ رسولؐ سے محبت کا اظہار اس کی اطاعت یا اتباعِ سنت کی شکل میں ہوگا، نہ کہ اس کی عبادت کی شکل میں (خواہ وہ غائبانہ پکار کی شکل میں ہو یا نذر و نیاز کی صورت میں)۔ اللہ تبارک و تعالیٰ سے محبت کا جو عملی اظہار ہونا چاہیے، اسکو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی محمد ﷺ کی اتباع و پیروی میں محصور کردیا ہے، چنانچہ فرمایا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران:۳۱)

"(اے نبیؐ!) آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔"

یعنی اللہ سے محبت کے دعوے کی سچائی اتباعِ رسولؐ سے مشروط ہے، اور بغیر اتباعِ رسولؐ یہ دعویٰ باطل محض ٹھہرے گا۔

اب آیئے، حُبِّ رسولؐ کے کچھ پہلوؤں پر غور کریں۔ نبی ﷺ نے فرمایا :

"اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! تم لوگوں میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے اپنے والدین اور اولاد سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔" (صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب ۸ حب الرسول ﷺ من الایمان)

اس سے اگلی روایت میں والدین اور اولاد کے ساتھ تمام انسانوں سے زیادہ محبت کرنے کے الفاظ آئے ہیں۔ گویا حُبِّ رسولؐ ایمان کا لازمی جزو ہے اور اس کے بغیر ایمان ایمان ہی نہیں۔ حُبِّ رسولؐ ایمان کی اساس و مدار ہے۔ لیکن یہ بات ذہن نشین کرلی جائے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کا ثبوت اتباعِ رسول کو قرار دیا ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے بھی احادیث میں اپنی محبت کا معیار متعین فرمادیا ہے، جو "اتباعِ سنتِ رسول" ہی ہے۔ ملاحظہ ہو :

"میرے سب امتی جنت میں جائیں گے سوائے ان کے جو انکار کریں۔ کہا گیا کہ انکار کون کرے گا۔ فرمایا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کیا۔" (صحیح بخاری، کتاب الاعتصام)

"جس نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔" (جامع ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب الایمان)

"جس نے میری سنت سے انحراف کیا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔"

(صحیح بخاری، کتاب النکاح)

درج بالا بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حُبِّ رسولؐ اور اطاعتِ رسولؐ باہم لازم و ملزوم ہیں اور نبی ﷺ کی اطاعت یا اتباعِ سنت ہی صحیح معنوں میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کا تقاضا ہے۔ اب جو کوئی اس کو صحیح معنوں میں پورا کرے وہی حلاوتِ ایمان پاسکتا ہے۔ اور جو لوگ اتباعِ سنت سے دور ہیں وہ حُبِّ رسولؐ تو کیا ایمان کی اس لذت سے بھی محروم ہیں! تو آیئے ذرا دیکھیں کہ آج رسول اللہ ﷺ سے عشق و محبت کا دم بھرنے والے قرآن و حدیث کی اس کسوٹی پر کہاں تک پورے اترتے ہیں، اور ان کے عقائد و اعمال اور رسومات، سیرت و صورت، کردار و گفتار اور رہن سہن سنتِ رسولؐ اور آپؐ کی تعلیمات و فرمودات سے کہاں تک ہم آہنگ ہیں :

۱۔ کیا اللہ اور اسکے رسولؐ نے تفرقہ پردازی کو ممنوع قرار نہیں دیا اور اعتصام حبل اللہ یعنی قرآن و سنت سے تمسک کے ذریعے ایک جماعت میں پیوست رہنے کا حکم نہیں دیا؟

۲۔ کیا اللہ کے رسولؐ نے قبر پرستی پر لعنت نہیں فرمائی اور قبر پرستی کے شرک سے بچنے کے لئے قبروں کو کچا اور زمین کے برابر رکھنے کا حکم نہیں دیا، اور قبروں کو پکا کرنے، ان پر گنبد وغیرہ بنانے اور وہاں جمع ہونے، مجاور بن کر بیٹھنے سے منع نہیں کیا، اور قبروں کو سجدہ گاہ بنانے والوں پر لعنت نہیں فرمائی؟

۳۔ کیا عید میلاد النبیؐ منانا نبی ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کی سنت ہے یا ہنود، یہود و نصاریٰ کی، جو جنم اشٹمی، کرسمس وغیرہ کی شکل میں اپنے نبی اور بزرگوں کے دن مناتے ہیں، جبکہ نبی ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنھم نے نہ عید میلاد النبیؐ منائی اور نہ ہی کسی اور نبی یا ولی کا کوئی دن منایا؟

۴۔ کیا سوئم، دسواں، چالیسواں، برسی وغیرہ نبی ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی سنت ہے یا ہندوؤں کی؟

۵۔ کیا تعویذ گنڈے وغیرہ کو نبی ﷺ نے شرک قرار نہیں دیا اور ایسا کرنے سے منع نہیں کیا؟

غور کرنے کی بات ہے کہ درج بالا مشرکانہ افعال و بدعات سے بھرپور طرزِ زندگی اپنانے والے کیا نبی ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی سنت سے منحرف نہیں اور آپ کی تعلیمات کی صریح خلاف ورزی کے مرتکب ہو کر حبِ رسولؐ اور حلاوتِ ایمان سے محروم نہیں؟

بلاشبہ وہ لوگ خوش نصیب ہیں جن کی زندگیاں کفر و شرک اور بدعات سے یکسر پاک ہیں، جنہوں نے "اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ" کی پکار پر "اٰمَنَّا" کہہ کر اس مبارک اجتماعیت میں شمولیت اختیار کرلی ہے جس کا مشن نبی ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے اُسوہ کو اپنا کر ایمانِ خالص کی دعوت دینا ہے۔ اُن سے تو یہی توقع ہے کہ انہوں نے پورے شعور کے ساتھ ایمان کے تقاضوں کو سمجھ کر ان کو کماحقہ پورا کرنے کا عزم کرلیا ہوگا۔ بہر حال، ان کی یاددہانی کے لئے یہ بات عرض کرنا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کو ایمان کی عظیم نعمت سے نوازا ہے، "خیر امت" کا لقب عطا فرمایا ہے، اس پر مالکِ حقیقی کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ حلاوتِ ایمان کے سچے ذوق کے حامل ہو کر خاندان، معاشرے اور نام نہاد متمدن اقوامِ عالم سے مرعوبیت کے طوق کو اتار پھینکیں اور نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ اپنے گھر کے ماحول کو سنت کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کریں۔ پھر ہماری چال ڈھال، گفتار و کردار اور شب و روز اور ہر گوشۂ حیات عبادالرحمٰن کا نمونہ پیش کرے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مالکِ حقیقی ہمیں صبر و استقامت کی صفت سے نوازدے تاکہ اس راہ کی دشواریاں آسان ہو جائیں اور اس مبارک اجتماعیت کے ہر فرد کی زندگیاں پوری طرح سنت رسولؐ کے سانچے میں ڈھل جائیں، زندگی کا ایک ایک گوشہ اور پہلو سنت کے رنگ میں رنگ جائے اور مخلص مومنین آپس میں ایک دوسرے کے لئے محبت و شفقت، احترام و خلوص، اتحاد و یگانگت کے ساتھ باہم شیر و شکر ہو کر رہیں، اور رب ذوالجلال کی تائید و نصرت سے اسلام و مسلمین کو سارے عالم میں غلبہ ہو! آمین

جمعہ/ ۲ربیع الثانی ۱۴۲۰ ہجری مطابق ۱۶ جولائی ۱۹۹۹ عیسوی

عالمِ طاغوت

محمد انور طالب

دعوتی حلقوں میں اکثر لفظ "طاغوت" کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ تحریروں اور تقریروں میں اکثر اس سے اجتناب کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ سیاست و صحافت میں بھی یہ لفظ از راہِ رسم کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ بعض متجسس بھی کبھی یہ سوال کر لیا کرتے ہیں کہ طاغوت کا کیا مفہوم ہے۔ اور جو لوگ اس سے کسی قدر واقف ہیں وہ اس کے ساتھ ویسا معاملہ نہیں رکھتے جیسا کہ رکھنا چاہیے۔ اس مسئلے کی دینی اہمیت کے پیش نظر اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کسی تحریر میں اس مضمون کا کما حقہ احاطہ کیا جائے۔ چنانچہ آئندہ سطور میں اس پر تفصیلاً گفتگو کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جو امید ہے کہ قارئین کیلئے مفید ثابت ہوگی۔

طاغوت کی لغوی بحث

طاغوت طغی سے مشتق ہے۔ طغی حد سے گذرنے اور سرکشی و بغاوت کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ طاغوت اس کا اسم مبالغہ ہے جس کے معنی ہوئے "ہر حد سے گذر جانے والا، انتہائی سرکش و باغی"۔ طغی سے لفظ طغیان بنتا ہے جس کے معنی حد سے بڑھ جانا، سمندر کا جوش مارنا، سرکشی، سرکش ہونا کے علاوہ شر کا سرغنہ، شیطان، معبود باطل، کفر میں غلو کرنا، ظلم اور گناہ میں حد سے بڑھ جانا، پانی کا اپنی حد سے بلند ہو کر سیلاب کی شکل اختیار کر لینا، وغیرہ شامل ہیں۔ لفظ طاغوت چونکہ اسی مادے سے بنا ہے اس لئے اسم مبالغہ ہونے کی وجہ سے طغیان کے ان تمام معنوں کو بڑی حد تک اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ طغی کے دیگر مشتقات کی مختلف صورتیں قرآن مجید کی متعدد آیات میں آئی ہیں جو لفظ طاغوت کے معانی و مفاہیم کے صحیح ادراک میں رہنمائی کرتی ہیں، مثلاً طُغْيَانِهِم (البقرۃ ۱۵، الاعراف ۱۸۶، یونس ۱۱) طُغْيَانًا (المائدۃ ۶۸) طَغَىٰ (طٰہٰ ۲۴، النجم ۱۷، النٰزعٰت ۱۷) يَطْغَىٰ (طٰہٰ ۴۵، العلق ۶) تَطْغَوْا (طٰہٰ ۸۱) طَاغِينَ (الصّٰفّٰت ۳۰، صٓ ۵۵، القلم ۳۱، النبا ۲۲) أَطْغَيْتُهُ (قٓ ۲۷) طَاغُونَ (الذٰریٰت ۵۳) أَطْغَىٰ (النجم ۵۲) طَغَا (الحاقۃ ۱۱) طَغَوْا (الفجر ۱۱) طَغْوَاهَا (الشمس ۱۱)۔ ان آیات کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مذکورہ الفاظ سرکشی و بغاوت، راہ حق سے دوری، حد سے تجاوز کرنے، ظلم و زیادتی اور اللہ کی نافرمانی میں حد سے بڑھ جانے وغیرہ کے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔

لغت میں لفظ طاغوت کی تشریح اس طرح کی گئی ہے:

الطاغوت عبارة عن كل متعد و كل معبود من دون الله و يستعمل في الواحد والجمع، قال (فمن يكفر بالطاغوت، والذين اجتنبوا الطاغوت، اولياء هم الطاغوت، يريدون ان يتحاكموا الى الطاغوت) فعبارة عن كل متعد، ولما تقدم سمي الساحر والكاهن والمارد من الجن و الصارف عن طريق الخير طاغوتا ووزنه فيما قيل فعلوت نحو جبروت و ملكوت و قيل اصله طغووت ولكن قلب لام الفعل نحو صاعقة وصاقعة ثم قلب الواو الفا لتحركه وانفتاح ما قبله (المفردات)

"طاغوت سے مراد ہر وہ شخص ہے جو حد سے تجاوز کرنے والا ہو اور ہر وہ چیز جس کی اللہ کے سوا پرستش کی جائے اسے طاغوت کہا جاتا ہے۔ اور یہ واحد و جمع دونوں میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں فرمایا "جس نے طاغوت کا انکار کیا"(۱) "جنہوں نے طاغوت کی بندگی سے اجتناب کیا"(۲) "ان کے دوست طاغوت ہیں"(۳) "اور چاہتے ہیں کہ اپنا مقدمہ طاغوت کے پاس لے جا کر فیصلہ کرائیں۔"(۴) یہ بات واضح ہو گئی کہ ہر حد سے تجاوز کرنے والا شخص طاغوت ہے۔ لہذا نافرمانی میں حد سے تجاوز کرنے کی بنا پر ساحر، کاہن، سرکش جن اور ہر وہ چیز جو راہ حق سے پھیرنے والی ہو اسے طاغوت کہا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک یہ فعلوت کے وزن پر ہے جیسے جبروت، ملکوت۔ اور بعض کے نزدیک اس کی اصل طغووت ہے۔ پھر صاعقۃ اور صاقعۃ کی طرح پہلے لام کلمہ میں قلب کیا گیا اور واؤ کے متحرک اور ماقبل کے مفتوح ہونے کی وجہ سے اسے الف سے تبدیل کیا گیا۔" (المفردات)

"اس شخص کو بھی طاغوت کہتے ہیں جو کسی کو سراط مستقیم سے بہکا کر غلط راستے پر لگائے۔" (تاج العروس)

طاغوت سے اجتناب کی ضرورت

اوپر بیان کردہ تعریف و توضیح کی روشنی میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایمان کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ طاغوت ہے۔ قبول حق میں سب سے زیادہ یہی مزاحم ہوتا ہے۔ اس لئے ایمانی کارروائی میں سب سے پہلے اسی پر تیشہ چلایا جاتا ہے۔ اس سے لاتعلقی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ طاغوت سے برأت و بیزاری ایمان کی شرط لازم ہے اور اس کے بغیر ایمان قابل قبول نہیں۔ چنانچہ دائرہ ایمانی میں داخلے کے وقت پڑھے جانے والے کلمہ توحید: لا الٰہ الا اللّٰہ (نہیں کوئی معبود مگر اللہ) میں "لا" کے ذریعے ہر قسم

(۱) البقرۃ ۲۵۶ (۲) الزمر ۱۷ (۳) البقرۃ ۲۵۷ (۴) النساء ۶۰

کے طاغوت کی نفی کی جاتی ہے اور "الا" کے لفظ سے بصیغہ حصر اللہ کے الٰہ ہونے کا اثبات کیا جاتا ہے۔ قرآن میں کئی بار یہ لفظ (الطاغوت) اللہ کے مقابلے میں آیا ہے جو اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ اس سے مراد وہ ہستیاں ہیں جو لوگوں میں اثر و نفوذ حاصل کرنے کے بعد ان کا الٰہ و رب بننے کی کوشش کرتی ہیں یعنی ان کے قلب و ذہن میں رب کا مقام حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں، پھر ان پر اپنا حکم چلاتی ہیں، انھیں اپنا محکوم و غلام، پرستار و عابد، عابد و ساجد بناتی ہیں۔ قرآن میں ان کو "ارباب من دون اللہ" کہا گیا ہے۔ الٰہ کا مقام حاصل کرنے والی ان ہستیوں کا کفر ایمان باللہ کی پہلی اور لازمی شرط ہے جیسا کہ قرآن کی اس آیت سے واضح ہے:

فمن يكفر بالطاغوت ويؤمن بالله فقد استمسك بالعروة الوثقى لا انفصام لها (البقرة:٢٥٦)

"پس جس نے طاغوت کا کفر کیا اور اللہ پر ایمان لے آیا تو اس نے ایسے مضبوط حلقے کو تھام لیا جو ٹوٹنے والا نہیں۔"

حدیث میں نبی ﷺ نے اس بات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

من قال لا اله الا الله وكفر بما يعبد من دون الله حرم ماله ودمه وحسابه على الله (صحیح مسلم کتاب الایمان، باب الامر بقتال الناس)

"جس نے لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کیا اور اللہ کے سوا جس کی بھی عبادت کی جاتی ہے اس کا کفر کیا تو اس کی جان و مال محفوظ ہو گئے اور اس کا حساب اللہ کے سپرد ہے۔"

چونکہ طاغوت کا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ

يخرجونهم من النور الى الظلمت (البقرة:٢٥٧)

"وہ انھیں روشنی سے اندھیرے میں لے جاتے ہیں۔"

اس لئے اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ان سے خبردار کرنے اور اس معاملے کی اہمیت و نزاکت کا احساس دلانے کے لئے ہر دور میں اپنے پیغمبر بھیجے اور ان سے بچنے کی تلقین فرمائی:

ولقد بعثنا في كل امة رسولا ان اعبدوا الله واجتنبوا الطاغوت (النحل:٣٦)

"اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا تاکہ (انھیں دعوت دے کہ) وہ اللہ کی بندگی کریں اور طاغوت سے اجتناب کریں۔"

اور جو لوگ طاغوت سے اجتناب کر لیں ان کے لئے مالک کا مژدہ ہے کہ

والذين اجتنبوا الطاغوت ان يعبدوها وانابوا الى الله لهم البشرى فبشر عباد ﴿﴾ الذين يستمعون القول فيتبعون احسنه اولئك الذين هدىهم الله واولئك هم اولوا الالباب ﴿﴾ (الزمر:١٧،١٨)

"جن لوگوں نے طاغوت کی بندگی سے اجتناب کیا اور اللہ کی طرف رجوع کیا، ان کے لئے خوشخبری ہے۔ پس (اے نبی!) بشارت دے دو میرے ان بندوں کو جو بات کو غور سے سنتے ہیں اور اس کی بہترین طریقے سے پیروی کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے اور یہی لوگ دانش مند ہیں۔"

اسلام کی معاشرتی حدود کے قیام اور مومنوں کے باہمی تعلقات و معاملات کی اہمیت کے پیش نظر عمر رضی اللہ عنہ نے سورۃ البقرۃ، النسآء، المائدۃ اور النور کے مطالعے کی خصوصی ہدایت فرمائی ہے۔ یہ چاروں سورتیں مدینے میں نازل ہوئی ہیں اور ان میں صحیح اسلامی معاشرے کے قیام و استحکام کے لئے بہت ہی واضح اور قیمتی ہدایات دی گئی ہیں۔ مدنی سورتوں کی یہ خصوصیت ہے کہ اُن میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کی ان معاملات و مسائل میں رہنمائی فرمائی ہے جو ہجرت کے بعد ایک آزاد اسلامی ریاست کے قیام کی صورت میں وہاں آباد مختلف انسانی گروہوں کے ساتھ رہتے ہوئے انھیں درپیش ہوئے۔ اُن میں اکثریت اہل کتاب کی تھی جو الہامی کتب کے ماننے کا دعویٰ کرتے تھے لیکن ان کا عقیدہ اور عمل اس کے برعکس تھا۔ مالک سورۃ النسآء کی مختلف آیات میں ارشاد فرماتا ہے:

الم تر الى الذين اوتوا نصيبا من الكتب يؤمنون بالجبت والطاغوت ...... فلن تجد له نصيرا ﴿﴾ (النسآء:٥١،٥٢)

"کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب الٰہی (کے علم) میں سے کچھ حصہ دیا گیا تھا جبکہ (ان کا حال یہ ہے کہ) وہ جبت اور طاغوت پر ایمان رکھتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ لعنت کر دے تو پھر تم اس کا کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔"

منافقین کی ان طاغوت پرست اہل کتاب اور ان کے علماء سے راہ و ربط کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

الم تر الى الذين ...... يريدون ان يتحاكموا الى الطاغوت ...... الخ (النسآء:٦٠)

"کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر بھی جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں، مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لئے طاغوت کی طرف رجوع کریں۔ حالانکہ انھیں تو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس کا کفر کریں۔ اور شیطان انھیں بھٹکا کر (راہ راست سے) بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔"

ان آیات کی تفسیر میں بخاری درج ذیل اقوال لائے ہیں کہ:

وقال جابر كانت الطواغيت التي يتحاكمون اليها في جهينة واحد وفي اسلم واحد وفي كل حي واحد كهان ينزل عليهم الشيطن وقال عمر الجبت السحر والطاغوت الشيطن وقال عكرمة الجبت بلسان الحبشة الشيطن والطاغوت الكاهن (صحیح بخاری: کتاب التفسیر، باب قوله وان كنتم مرضى ...)

"جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ طاغوت وہ لوگ ہیں جن کے پاس (جاہلیت میں) لوگ اپنے مقدمات کا فیصلہ کرانے کے لئے جایا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک قبیلہ جہینہ میں تھا، ایک قبیلہ اسلم میں تھا اور ہر قبیلے میں ایک طاغوت ہوتا تھا۔ یہ وہی کاہن ہوتے تھے جن پر شیطان اترا کرتا تھا۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جبت کو سحر (جادو) اور طاغوت کو شیطان کہا ہے۔ اور عکرمہ نے کہا کہ "الجبت" حبشی زبان میں شیطان کو کہتے ہیں اور الطاغوت سے مراد کاہن ہیں۔"

طاغوت کی تشریح اہل طاغوت کی زبان سے

قرآن و حدیث سے طاغوت کی تشریح کے بعد اب ان لوگوں کی تحریروں کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جو کسی نہ کسی مسلک و فرقے سے وابستہ ہیں۔ ان سے

معلوم ہوگا کہ یہ لوگ طاغوت کے قرآنی تصور سے آشنا ہوتے ہوئے بھی طاغوت پرستی کا شکار ہیں! اس کا مقصد صرف اس تضاد کو سامنے لانا ہے جو ان کے قول و فعل اور وہ زندگی میں پایا جاتا ہے۔ ان کا حال ان صوفیوں سے مختلف نہیں جن کی کتابوں میں جب قرآن و حدیث، توحید و رسالت کا بیان ہوتا ہے تو وہ تحریریں زبردست علمی شاہکار معلوم ہوتی ہیں، لیکن اس کے بعد وہ تصوف کے اسرار و رموز اور جذب و سلوک اور کشف و کرامات کے واقعات بیان کرنے پر آتے ہیں تو ان کی یہی تحریریں قرآن و حدیث کا بدترین استہزاء نظر آتی ہیں۔ جن لوگوں کی تحریریں آگے پیش کی جارہی ہیں وہ ان ہی صوفیوں کے حاشیہ نشیں و خوشہ چیں ہیں۔ طاغوت کی تعریف و تشریح کے حوالے سے انہوں نے بظاہر درست و مناسب نکتہ نظر بیان کیا ہے تاہم کفر بالطاغوت کے سلسلے میں قرآن مجید کے واضح اور مطلق حکم کے باوجود حیرت انگیز طور پر انہوں نے چپ سادھ رکھی ہے۔ اس معاملے میں ان کی زبانیں گنگ اور قلم کند نظر آتے ہیں۔ اگر کسی نے اس سلسلے میں لب کشائی کی بھی تو وہ بھی ان کے دفاع میں۔ اگر کوئی دبے الفاظ میں طاغوت کا رد کرنے کی کوشش کرتا بھی ہے تو محض جزوی طور پر (اپنے مسلک کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے) یا اپنی پسند کے مطابق، اور وہ بھی زبانی جمع خرچ کی حد تک۔ اسطرح طاغوت کے انکار یا اس کے رد کے بارے میں ان کی پراسرار خاموشی خود ان کی اس سلسلے میں پیش کردہ تصریحات کو بے اثر بنادیتی ہے۔ مثال کے طور پر دین اسلام میں مختلف جماعتوں، گروہوں، فرقوں اور مسلکوں کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں۔ قرآن و سنت کی تعلیمات تفرقہ بازی سے سختی سے منع کرتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ لوگ کسی نہ کسی جماعت، فرقے، مسلک یا مذہب کے ساتھ عملی طور پر منسلک ہیں یا اس کی قیادت و سرپرستی کررہے ہیں۔ پھر ان گروہوں کے سرپرستوں کی عزت و تکریم سے لے کر ان سے موافقت و سازگاری بلکہ باہمی اتحاد و تعاون کا معاملہ زور و شور سے چل رہا ہے۔ جبکہ ان کے اکابرین و سرپرست بالفعل ارباب من دون اللہ کا روپ دھار چکے ہیں یا ان فرقہ پرستوں نے ہی ان کو اس منصب پر پہنچایا ہے۔ الغرض یہ فرقے حقیقت میں طاغوتی حیثیت اختیار کرچکے ہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے واضح حکم کی خلاف ورزی میں قائم و دائم اور راہ حق میں مزاحم ہیں۔ واضح شرکیہ عقائد و افعال کے باوجود ان کے مراکز اور سرپرستوں کے خلاف ان کی طرف سے موثر آواز نہیں اٹھائی جاتی بلکہ ان کے ساتھ ایک طرح کی سازگاری برقرار رکھنے کی روش اپنائی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے پرستاروں کی حمایت اور ان سے ووٹ و نوٹ کے حصول کے لئے کتاب و سنت کے یکسر خلاف تعمیر شدہ قبروں، آستانوں پر حاضری، فاتحہ خوانی، مراسم عبودیت اور دستاربندیوں تک میں شرکت کو گوارا کرلیا جاتا ہے (ملاحظہ ہو روزمرہ اخباری سرخیوں اور تصاویر کے آئینے میں جماعت اسلامی اور دیگر مذہبی جماعتوں کے رہنماؤں کا کردار۔ گزشتہ سال ربیع الاول کے مہینے میں جماعت اسلامی نے بھی جشن عید میلاد النبیؐ دھوم دھام سے منا کر خلاف شریعت کام میں خوب حصہ لیا۔ حوالے کیلئے ۱۳/۱۴ ربیع الاول ۱۴۱۹ھ کے اخبارات خصوصاً روزنامہ نوائے وقت ملاحظہ فرمایئے)۔ امریکہ و برطانیہ وغیرہ کو سب سے بڑا طاغوت قرار دینے والے ان ممالک کے نظام ہائے حکومت کی اساس جمہوریت جیسے طاغوتی نظریے کو اپنے گلے کا ہار بناکر اس کے ذریعے نوٹ اور ووٹ کا کھیل کھیلنے میں مشغول نظر آتے ہیں۔ اس طرح اسلام پسندی کے نمائشی نعروں کے پس پردہ عالمی استعمار کی حاشیہ برداری کا کردار ادا کرنے میں کوئی عار نہیں محسوس کی جاتی (اس سلسلے میں معروف مذہبی جماعتیں اور عالم اسلام کے کئی ممالک سرگرم عمل ہیں)۔ ان کے علاوہ عالم اسلام کے اکثر ممالک مشرقی یا مغربی ممالک کی زیر سرپرستی موروثی اور مطلق العنان حکمرانوں کے تسلط میں ہیں جب کہ وہاں کے علماء و مذہبی دانشور ان کے وظیفہ خوار و حاشیہ بردار اور ان کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں۔

اسی طرح تصوف کی سرپرستی و اشاعت کرنے والے صوفیاء کو اسلام اور اسلامی دنیا کی نامور اور برگزیدہ ہستیاں سمجھا جاتا ہے، جبکہ یہ دین اسلام کی مخالفت میں قائم کیا جانے والا ایک متوازی دین ہے جس کی بنیاد قرآن و حدیث کے خلاف نظریہ وحدت الوجود ہے، اور صوفیاء اس اتحادی دین اور مرکب گمراہی کے داعی و سرپرست اور اپنی خدائیوں کے دعویدار تھے۔ ان فرقوں سے وابستہ علماء اور دانشوروں کی اکثریت صوفیاء اور تصوف سے مرعوب ہے، ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے نام نہاد "اسلامی تصوف" میں غیر اسلامی آمیزش ثابت کرنے کا عظیم تحقیقی علمی کارنامہ بھی انجام دیا ہے اور صوفیاء کو تاریخ اسلام کی کڑیاں اور آفتاب و مہتاب قرار دے رہے ہیں (ملاحظہ ہو پروفیسر سلیم چشتی صاحب کی کتاب "اسلامی تصوف اور اس میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش")۔ یہ سب کچھ کتاب و سنت کی تعلیمات کے مطابق طاغوت کا رد یا انکار نہیں بلکہ طاغوت پرستی ہے، خواہ ان کا قلم طاغوت کی تشریح و توضیح میں علم و حکمت کے گوہر آبدار ہی کیوں نہ افشاں کرتا پھرے۔

تحریروں کے اقتباسات

(۱) اپنے ترجمہ قرآن میں عبدالستار محدث دہلوی لکھتے ہیں:

"جو چیز اللہ کے سوا پوجی جائے وہ طاغوت ہے۔"

(قرآن مترجم محشیٰ از عبدالستار محدث دہلوی، صفحہ ۱۱)

(۲) ابن جریر طبری کہتے ہیں:

"شیطان اور جن لوگوں کی طرف وہ دعوت دیتے ہیں، سب طاغوت ہیں اور جس کی بھی اللہ کو چھوڑ کر بندگی کی جائے وہ بت اور طاغوت ہے۔"

(صحف التقریب مختصر تفسیر امام الطبری، مطبوعہ دار التقریب، اسکندریہ، مصر)

(۳)

Jabir said, "*Al-Tawaghit* (pl. of Taghut) are Priests (1) inspired by Satan, distributed among localities."

(کتاب التوحید انگریزی ترجمہ [illegible])

(۱) لفظ Priest کے معانی میں دینی، مذہبی رسوم کی تبلیغ کے لئے وقف شدہ شخص، مقدس عہدیدار، عبادت عامہ کے امور، قربانی یا عبد و معبود کے درمیان وسیلہ، مذہبی منصب کی ادائیگی کرنے والے اشخاص شامل ہیں۔ (مقتدرہ قومی زبان کی "قومی انگریزی اردو لغت" صفحہ ۱۵۵۱)

کتاب التوحید کی اس عبارت کی تائید قرآن مجید کی ان آیات سے بھی ہوتی ہے کہ

وَإِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ إِلٰى أَوْلِيٰٓئِهِمْ — (الانعام:۱۲۱)

"اور بے شک شیاطین اپنے دوستوں پر القا کرتے ہیں۔"

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا إِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُوْنَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ (التوبۃ:۳۴)

"اے ایمان والو! احبار و رہبان (مولویوں اور پیروں) کی اکثریت لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھاتی ہے اور انہیں اللہ کے راستے سے بھی روکتی ہے۔"

ترجمہ: جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، "الطواغیت (طاغوت کی جمع) وہ پادری (پروہت، پجاری، کاہن، مبلغ، وغیرہ) ہوتے ہیں جن پر شیطان القاء کرتا ہے، اور یہ انسانی آبادیوں میں ہر جگہ پھیلے ہوتے ہیں۔"

یہی بات شیخ عبداللہ بن مبارک ؒ سے بھی ان الفاظ میں منسوب ہے:

وھل افسد الدین الا الملوک ۔ و احبار سوء و رھبانھا

(ابن تیمیہ کی کتاب العبودیہ کا مقدمہ از عبدالرزاق ملیح آبادی)

"کیا دین میں بگاڑ بادشاہوں، علماء سوء اور صوفیوں کے سوا کسی اور نے پیدا کیا ہے!"

(۴) کتاب التوحید کے اردو ترجمے (از عطاء اللہ ثاقب) میں جابر رضی اللہ عنہ کا قول ان الفاظ میں دیا گیا ہے:

الطواغیت کھان کان ینزل علیھم الشیطان فی کل حی واحد

(کتاب التوحید، صفحہ ۲۱۹)

"طاغوت وہ کاہن ہیں جن پر شیطان اترتا تھا اور ہر قبیلے کا الگ الگ کاہن ہوتا تھا۔"

(۵) مصر کے سید قطب اپنی تفسیر "فی ظلال القرآن" میں طاغوت کی تشریح میں رقمطراز ہیں:

طاغوت "طغیان" سے بنا ہے۔ ہر وہ چیز جو حق کے خلاف ہو، جو ان حدود سے تجاوز کرے جو اللہ نے بندوں کے لئے مقرر کی ہیں، جسے اللہ پر ایمان اور اس کی مقرر کردہ شریعت کنٹرول نہ کرے، وہ طاغوت ہے۔ اسی طرح ہر وہ نظام جو اللہ کا وضع کردہ نہ ہو، طاغوت ہے۔ ہر وہ تصور، ضابطہ، طریقہ، رسم جو اللہ کی طرف سے نہ آیا ہو، طاغوت ہے۔ جس شخص نے ایسی تمام چیزوں کا، ان کی تمام شکلوں میں انکار کیا، صرف اللہ پر ایمان لایا اور زندگی کا ہر اصول اور ضابطہ اللہ سے حاصل کیا، اس نے نجات پالی۔ نجات پانے کی حقیقت کو یہاں اس تمثیل کے ذریعے بیان کیا گیا ہے کہ وہ ایک مضبوط حلقے کو تھامے ہوئے ہے جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے۔

اللہ پر ایمان ایک مضبوط رسی ہے جو کبھی ٹوٹتی نہیں۔ اسے پکڑنے والا راہ نجات سے بھٹکتا نہیں۔ یہ رسی ہلاکت اور نجات دونوں کے مالک سے مربوط ہے۔ ایمان اپنی حقیقت کی رو سے کائنات کی اولین حقیقت کو، جس پر کائنات کے تمام حقائق کا دارومدار ہے، پالیتا ہے جو شخص اس رسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیتا ہے وہ اپنے رب کی طرف جانے والی سیدھی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ پھر وہ نہ کسی دلدل میں دھنستا ہے، نہ راہ حق سے پیچھے ہٹتا ہے، نہ مختلف راہوں میں حیران و سرگرداں مارا مارا پھرتا ہے اور نہ ضلالت و گمراہی میں ہی مبتلا ہوتا ہے۔ اللہ جو اہل ایمان کا رفیق و دمساز ہے وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آتا ہے، جبکہ طواغیت، جو اہل کفر کے رفیق و دمساز ہیں وہ انہیں روشنی سے ہٹا کر تاریکیوں میں لیجاتے ہیں۔

ایمان نور ہے اور کفر ظلمت۔ اس سے بڑھ کر کوئی سچی حقیقت اور کوئی دقیق انداز بیاں نہیں۔ نور ایمان ایک ہی ہے اور وہ ایک ہی راستے کی طرف انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس کے برعکس کفر کی، ضلالت کی تاریکیاں مختلف اور متنوع ہیں۔ انسان جب اللہ کے نور کو جو ایک ہے، حق کے نور کو جو ایک اور واضح ہے ترک کر دیتا ہے تو وہ انواع و اقسام کی تاریکیوں کے جنگل میں جو سب کی سب ظلمات ہیں، گم ہو جاتا ہے۔

(تفسیر فی ظلال القرآن مترجم، جلد ۱، تشریح آیات سورۃ البقرۃ ۲۵۶، ۲۵۷)

طاغوت ہر وہ اقتدار ہے جو اللہ کے اقتدار اعلیٰ سے آزاد ہو۔ طاغوت ہر وہ حکم ہے جس کی بنیاد اللہ کی شریعت پر نہ ہو۔ طاغوت حق سے تجاوز اور تعدی کو کہتے ہیں اور اللہ کے اقتدار اعلیٰ، اس کی الوہیت اور حاکمیت کے خلاف تعدی، سب سے بڑی تعدی اور سب سے شدید طغیان ہے۔ اور یہ مفہوم "طاغوت" کے لفظ اور معنی پر سب سے زیادہ چھایا ہوا ہے۔

اہل کتاب نے اپنے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کی پرستش نہیں کی، البتہ ان کے وضع کردہ قوانین کی پیروی کی اور ان کے مقابلے میں شریعت الٰہی کو ترک کر دیا۔ اس جرم کے ارتکاب کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں احبار و رہبان کا "بندہ" بتایا اور انہیں مشرک قرار دیا۔ یہی دقیق مفہوم یہاں "عبد الطاغوت" میں مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انہوں نے "طاغوت کی بندگی کی" یعنی ان کے اقتداروں کی جو اللہ سے باغی اور اس کے حق بندگی سے تجاوز کرنے والے تھے۔ اہل کتاب نے ان کی بندگی رکوع و سجود کے معنی میں نہیں کی۔ انہوں نے ان کی بندگی اتباع اور اطاعت کے لحاظ سے کی۔ اور یہ ایک ایسی عبادت ہے کہ اس کا مرتکب اللہ کی عبادت اور اس کے دین سے خارج ہو جاتا ہے۔

(ایضاً: جلد ۳، تشریح سورۃ المائدۃ: ۶۰)

(۶) دار الحدیث، مکہ مکرمہ کے استاذ محمد بن جمیل زینو اپنی کتاب "الفرقۃ الناجیۃ" جسے وزارت اسلام برائے مطبوعات نے مکہ مکرمہ سے شائع کیا ہے، میں "احذروا الطواغیت" (طاغوتوں سے ہشیار رہو) کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

طاغوت ہر وہ ہستی ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر اس کی بندگی کی جائے اور وہ اس بندگی پر راضی ہو، خواہ وہ معبود ہو یا اس کی پیروی کرنے والا۔ اللہ نے رسولوں کو اس لئے بھیجا کہ وہ اپنی اقوام کو اللہ کی عبادت کا حکم دیں اور طاغوت سے بچنے کا حکم دیں، جیسا کہ اللہ کا فرمان ہے

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ

یہ طواغیت کثرت سے پائے جاتے ہیں، جن میں سے پانچ بڑے یہ ہیں:

(I) **شیطان**: جو کہ غیر اللہ کی طرف بلانے والا ہے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:

أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ وَأَنِ اعْبُدُونِي هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ۝ (یٰس ۶۰ تا ۶۱)

"اے آدم کے بچو! کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی بندگی نہیں کرو گے۔ یقیناً وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور یہ کہ میری بندگی کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔ مگر وہ تمہاری اکثریت کو بہکا لے گیا، کیا تم عقل نہیں رکھتے تھے؟"

(II) **ظالم حاکم**: جو اللہ تعالیٰ کے احکام میں تغیر و تبدل کرے، مثلاً ایسا دستور وضع کرنے والا جو اسلام کے خلاف ہو اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے، جو ان شریعت سازوں کی شریعت سازی کی تکفیر کرتا ہے:

أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُم مِّنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَن بِهِ اللَّهُ (الشوریٰ ۲۱)

"کیا ان کے شریکوں نے ان کے لئے کوئی شریعت وضع کی ہے جس کی اللہ نے اجازت انہیں دی ہے؟"[1]

(III) وہ حاکم جو اللہ کے نازل کردہ قوانین کے علاوہ فیصلے کرے، جبکہ اس کا عقیدہ اللہ کے نازل کردہ احکام کی عدم صلاحیت کا ہو یا ان سے ہٹ کر فیصلے کی اجازت دے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ۝ (المائدۃ ۴۴)

---

[1] اس شریکوں میں ان ظالم حکمرانوں کے علاوہ صوفیاء بھی شامل ہیں جنہوں نے دین اسلام اور شریعت پر اپنا اختراع کردہ "دین طریقت" مسلط کر دیا ہے جو "وحدت الوجود" کے طاغوتی فلسفے پر مبنی ہے اور اکثریت ان کو گویا واللہ تعالیٰ ہی ہے! (راقم)

(IV) وہ جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ علم غیب کا دعویدار ہو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے

قُل لَّا يَعْلَمُ مَن فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ (النمل:٦٥)

(V) وہ جن کی لوگ پوجا پاٹ کریں، اللہ کو چھوڑ کر ان کے سامنے مراسم عبودیت بجالائیں اور وہ اس پر راضی رہیں۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:

وَمَن يَقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيٓ اِلٰهٌ مِّن دُونِهِ فَذٰلِكَ نَجْزِيهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِينَ (الانبیاء:٢٩)

"اور ان میں سے جو یہ کہے کہ میں بھی اللہ کے علاوہ کوئی معبود ہوں، اس کی سزا میں ہم اسے جہنم دیں گے۔ ظالموں کو ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔"

اور یہ جان لے کہ مومن پر طاغوت کا انکار واجب ہے۔ یہاں تک کہ وہ صاحب استقامت مومن بن جائے۔ اس کی دلیل اللہ کا یہ قول ہے

فَمَن يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انفِصَامَ لَهَا ۗ (البقرۃ:٢٥٦)

اور یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ غیر اللہ کی بندگی سے دامن چھڑائے بغیر اللہ کی عبادت کوئی نفع نہیں پہنچا سکتی۔ (مجموعۃ التوحید، صفحہ ...)

محمد بن جمیل زینو نے طاغوت کو پانچ بڑے طبقوں میں تقسیم کر کے صورت حال کو واضح تر کر دیا ہے۔ اس تقسیم میں پانچ کا عدد اور ہندی حرف تہجی "پ" ایک معنی خیز کردار ادا کرتے دکھائی دیتے ہیں جو طاغوتی نظام کے ایک خاص پہلو کی نمائندگی کرتے ہیں، مثلاً نوح علیہ السلام کی قوم کے پانچ اولیاء ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر۔ قرآن مجید میں انھیں الہۃ (یعنی خدا) کہا گیا ہے۔ ان کے بارے میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنھما کا قول ہے کہ:

"یہ سب قوم نوح کے صالح لوگ تھے۔ جب وہ مر گئے تو شیطان نے ان کی قوم کو یہ بات سجھائی کہ یہ نیک لوگ جس جگہ بیٹھتے تھے وہاں ان کی یادگار پتھر نصب کر دو اور ان پتھروں کو ان کے نام سے پکارو۔ سو انھوں نے ایسا ہی کیا۔ جب اگلے لوگ مر گئے اور علم ان سے جاتا رہا تب ان کی اولاد نے ان یادگاروں کی پرستش شروع کر دی۔" (صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ نوح)

ڈاکٹر اسرار احمد لکھتے ہیں:

"علامہ اقبال نے اپنی ایک نظم میں نقشہ کھینچا ہے کہ اللہ کا ارشاد ہے کہ یہ جو پیر ہے درمیان کر بیٹھ گئے ہیں کہ ان کو خوش کئے بغیر مجھ تک رسائی نہیں ہے۔ یہ سب ڈھکوسلہ ہے۔ ان کو یہاں سے ہٹاؤ۔ میرا دربار ہر ایک کے لئے کھلا ہے۔ علامہ کا شعر ہے ۔ کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے

پیران کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

کیا نہیں ہے کہ تمھاری دعا کسی پوپ، کسی پادری، کسی پنڈت، کسی پروہت، کسی پجاری کی وساطت سے مجھ تک پہنچ سکتی ہے (دیکھئے عجیب اتفاق ہے کہ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان حائل ہونے والے سب مناصبوں کے نام "پ" ہی سے شروع ہوتے ہیں)۔" (ماہنامہ میثاق، لاہور، مارچ ١٩٩٣ء)

غالباً ڈاکٹر صاحب "پ" کے مذکورہ بالا سلسلے میں پیر صاحبان کی "پ" کو فراموش کر گئے۔ اسی طرح پنجاب کے پنج پیروں کا اتنا شہرہ ہے کہ گویا ان کے بغیر زندگی بے مزہ ہو جائے۔ اسی طرح ہندوؤں کا "پیر پنجالی"، "پنج پاتر" (پوجا کے پھول)، سکھوں کا "پنچ صاحب" اور "پنج تکے" وغیرہ ہیں۔ الغرض "پ" اور "پانچ" کی فہرست میں اور بھی بہت کچھ آتا ہے، مثلاً "پنج تن پاک" جن کا ذکر ہمارا موضوع بحث نہیں۔ یہ تو فقط ڈاکٹر صاحب کی خالی جگہیں پر کی ہیں۔ یہاں ایک اور بات قابل ذکر ہے بلاشبہ خالق و مخلوق میں یہ پردے حائل نہ ہونے چاہئیں، لیکن ڈاکٹر صاحب کی نظر سے شاید علامہ اقبال کی شخصیت کا یہ پہلو اوجھل نہ ہوگا کہ یہ "حائل پردے" ہٹنے کے بعد تو علامہ صاحب رب ذوالجلال سے گلے شکوے کرتے کرتے تمام ہی حدود سے تجاوز کر گئے اور مالک کائنات پر ان کی کبھی "تو بھی تو ہرجائی ہے" کا الزام عائد کر ڈالا۔ اس سے آگے بڑھے تو روز حساب کی پیشی پر بے لاگ تبصرہ فرمادیا:

روز حساب پیش ہو جب میرا دفتر عمل

آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی نگاہ سے علامہ صاحب کے وہ اشعار بھی گذرے ہوں گے جو انھوں نے نظام الدین اولیاء کی قبر پر پڑھے تھے کہ:

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا

بڑی جناب تیری فیض عام ہے تیرا

تیری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی

مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

(بانگ درا، نظم "التجائے مسافر")

غور فرمایئے ڈاکٹر صاحب کے ممدوح علامہ صاحب "بندگی" کے کس مقام پر پہنچے ہوئے ہیں۔ اب دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے زبان درازی کرنے والی ہستیاں جو ڈاکٹر صاحب کی نظر میں قابل محبت اور لائق احترام ہیں، کیا ان سے محبت طاغوت پرستی نہیں؟ دراصل انسان کے ازلی دشمن کی کوشش سے طواغیت کی ایک فوج تیار ہوتی رہی ہے اور ہر دور کے دانشور ان میں سے اپنی پسند کے چھانٹ لیا کرتے ہیں۔

(٧)

"طاغوت ہر باطل چیز کو کہتے ہیں، خواہ وہ معبود ہو یا غیر معبود۔ ان پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو سچا جانا جائے، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبادت میں ان کو بھی شریک کیا جائے، یا ان کے باطل ہونے کے باوجود ان کی موافقت اور اطاعت کی جائے۔ ان پر ایمان اور ان کی اطاعت کا حاصل یہ ہوا کہ یہود ان کی تعظیم کرتے ہیں اور ان کے باطل ہونے کے باوجود عبادت میں شیاطین کو بھی شریک کرتے ہیں، اور انھیں سجدہ کرتے ہیں۔"

(اسلام اور مسائل جاہلیت، ترجمہ ...، محمد ... سلفی، بمبئی، صفحہ ٢٣)

(٨)

"ابن قیم نے طاغوت کی ایک جامع تعریف کی ہے۔ طاغوت ہر اس چیز کو کہیں گے جس کے ذریعے بندہ اپنی حد سے آگے بڑھ جائے، خواہ وہ معبود ہو یا متبوع ہو یا مطاع۔ پس ہر قوم کا طاغوت وہ ہوتا ہے جسے اللہ اور اس کے رسول کے مقابلے میں لوگ اپنا معبود بنالیں، یا اللہ کے سوا اس کی بندگی کرنے لگیں، یا اللہ کی طرف سے بصیرت کے بغیر اس کی پیروی کرنے لگیں، یا اس کی اطاعت ان باتوں میں بھی کرنے لگیں جن کے متعلق نہیں علم نہ ہو کہ یہ اللہ کی اطاعت ہے۔" (ایضاً صفحہ ٢٨)

ابن قیم صاحب کی زبان سلفی صاحب اوپر بیان کردہ طاغوت کی "جامع تعریف" کا ایک بار پھر مطالعہ کریں اور پھر اس کا موازنہ ان کے اپنے عقیدہ سے کریں تو یہ خود اس کے مصداق نظر آئیں گے۔ ہم نہاد اہل حدیث یا سلفی العقیدہ لوگ اپنے ممدوحین ان

قیم اور وہ اپنے متبوع ابن تیمیہ اور وہ اپنے مطاع احمد بن حنبل کے حسب ارشاد قرآن و حدیث کے خلاف یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ میت کی روح اسی دنیاوی قبر میں لوٹ آتی ہے، میت کو کئے جانے والے سلام کو سنتی ہے، زائرین قبر کو پہچانتی ہے، ان کے لئے دعا کرتی ہے، تمام حواس و قویٰ، جو اتصال روح کے ساتھ ہی ممکن ہیں، سے عاری و خالی ہو کر بے جان ہو جانے والی منوں مٹی تلے مدفون لاش کی حس و شعور کا یہ عالم ہوتا ہے کہ قبر پر بیٹھنے والے پرندے کی جنس تک سے واقف ہو جاتی ہے۔ فیالعجب! قرآن و حدیث کا موقف کہ مردے قیامت تک مردے ہیں، ان میں جان کی رمق تک نہیں، حیات کا ذرہ بھی نہیں، روح ان کے بدن میں قیامت سے پہلے نہیں آسکتی، اور وہ سننے، دیکھنے، پہچاننے وغیرہ جیسے تمام حواس سے یکسر خالی ہیں، جب ان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو اسلام کا عقیدہ رکھنے کے دعویدار یہ لوگ اسے قبول نہیں کرتے بلکہ ان ہی ابن قیم، ابن تیمیہ اور ابن حنبل کے پیش کردہ قرآن و حدیث کے برعکس عقائد پر اصرار کرتے ہیں، اور اسطرح ان کے خود اپنی پیش کردہ تعریف کی روشنی میں طاغوت ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ اسلاف اولین میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین و تابعین و تبع تابعین رحمہم اللہ شامل ہیں اور ان معتبر ہستیوں کا ہرگز یہ عقیدہ نہیں جو یہ اپنائے ہوئے ہیں۔ اسطرح سے ان طاغوت پرست لوگوں کا سلفی العقیدہ ہونے کا دعویٰ بھی باطل ہو جاتا ہے۔

ان ہی ابن قیم صاحب نے اپنی کتاب الروح میں مذکور بالا عقائد کے علاوہ مُردوں کا حاضرین سے اُنس حاصل کرنا، قبر پر قرآن خوانی سے میت کو نفع پہنچنا، میت کو پوچھے جانے والے سوالوں کے جواب بتانا، مُردوں کو مُردوں کے ذریعے سلام کہلوانا، خواب میں مُردوں کا آکر برزخی احوال بتانا، نبی ﷺ سے اپنی ملاقات کا حال سنانا، اپنے مدفون خزانے کی اطلاع دینا، وغیرہ جیسے خلاف قرآن و حدیث واقعات بیان کئے ہیں۔ اور "الجواب الکافی" نامی کتاب میں عورتوں باندیوں سے عشق و محبت کے بازیادہ واقعات بشمول عشقیہ اشعار بیان کرتے کرتے جہاں صحابہ و تابعین کو بھی اس برائی میں ملوث کیا وہیں یہود و منافقین کی داؤد علیہ السلام اور نبی ﷺ پر لگائی جانے والی تہمتیں تک اپنے موقف کے استدلال میں بیان کردیں۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ قرآن و حدیث سے تمسخر کرنے والی یہ بے باک زبان کسی طاغوت ہی کے منہ میں ہو سکتی ہے نہ کہ کسی داعی حق میں!

(۹)

"طاغوت وہ ہے جس کی لوگ بندگی کریں اور اللہ کے علاوہ اسے پکاریں اور وہ اس پر راضی بھی رہے۔"

(العقیدۃ الاسلامیۃ من الکتاب والسنۃ الصحیحۃ، محمد جمیل زینو، صفحہ ۸)

(۱۰)

"طاغوت ہر وہ ہستی ہے جس کی عبادت اللہ کو چھوڑ کر کی جائے۔"

(روح الدین الاسلامی، عفیف عبد الفتاح طبارہ، بیروت، لبنان، صفحہ ۱۹۲)

(۱۱) شیخ عبد العزیز بن باز، رئیس العام، ادارۃ البحوث العلمیہ والافتاء والدعوۃ والارشاد، ریاض، سعودی عرب، "طاغوت سے کنارہ کش ہو جاؤ" کی تشریح میں لکھتے ہیں:

"جس نے اللہ کی فرمانبرداری، اطاعت کی اور اس کی وحی کے مطابق فیصلہ کیا، وہ اللہ کا عبادت گذار ہے اور جس نے غیر اللہ کے قانون کی اطاعت و فرمانبرداری کی اس نے طاغوت کی عبادت کی اور اس کے آگے سر تسلیم خم کیا، جیسا کہ اللہ کا فرمان ہے:

یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ ؕ وَ یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّہُمْ ضَلٰلاً ۢ بَعِیْدًا ﴿﴾ (النساء: ۶۰)

جبکہ بندگی صرف اللہ کی ہے۔ طاغوت کی بندگی سے بیزاری اور معاملات کے فیصلے طاغوت سے نہ چاہنا شہادت لاالہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ اور یہ کہ شہادت محمدا عبدہ و رسولہ کا تقاضا ہے۔ اللہ لوگوں کا رب اور الٰہ ہے جس نے ان کو پیدا کیا، جو انہیں حکم دیتا ہے اور منع کرتا ہے، جو زندگی اور موت دیتا ہے اور جو ان کے اعمال کا بدلہ انہیں دے گا۔ پس وہ اپنے ماسوا کو چھوڑ کر بندگی کا مستحق ہے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: الا لہ الخلق والامر "مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا چلتا ہے۔" چونکہ خالق ایک ہی ہے لہٰذا اسی کے حکم کی اطاعت واجب ہے۔ اللہ نے یہود اور نصاریٰ کا معاملہ بیان کیا ہے

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَہُمْ وَ رُہْبَانَہُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ (التوبۃ: ۳۱)

انہوں نے اپنے رب اللہ کے سوا ان (ارباب من دون اللہ) کی تحلیل الحرام اور تحریم الحلال میں اطاعت کی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَہُمْ وَ رُہْبَانَہُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَالْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوْٓا اِلٰہًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ؕ سُبْحٰنَہٗ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ﴿﴾ (التوبۃ: ۳۱)

عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ علماء و مشائخ (مولویوں اور پیروں) کی بندگی فقط ان کے نام جانور ذبح کرنے، ان کے حضور نذر و نیاز گذارنے اور ان کے سامنے سجود و رکوع جیسے معاملات ہوتے ہیں، اور جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام کا شرف حاصل کیا اور نبی ﷺ کو یہ آیت پڑھتے سنا تو کہنے لگے اے اللہ کے رسول! ہم ان کی اس طرح عبادت نہیں کرتے تھے جس طرح نصرانی چاہتے تھے (قبول اسلام سے قبل وہ نصرانی تھے)۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا یہ حقیقت نہیں کہ جو کچھ اللہ نے حلال کیا وہ اسے حرام قرار دیتے تھے اور تم بھی اسے حرام کہتے تھے اور جو کچھ اللہ نے حرام کیا وہ اسے حلال قرار دیتے تھے اور تم بھی حلال کہتے تھے؟ کہنے لگے ہاں کیوں نہیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہی ان کی عبادت کرنا ہے۔ (رواہ احمد، الترمذی وحسنہ)

(وجوب تحکیم شرع اللہ ونبذ ما خالفہ صفحہ ۸-۹)

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول محمد ﷺ کے قول کے علاوہ شریعت اسلامی میں کسی اور کا قول ہرگز قبول کرتے تھے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس کچھ لوگ بعض مسائل لے کر آئے تو آپ نے فرمایا "قریب ہے تم پر آسمان سے پتھر برسیں۔ میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اور تم کہتے ہو کہ ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا۔" اس کے معنی یہ ہیں کہ بندے پر واجب ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے قول کو مکمل طور پر تسلیم کرلے اور ہر ایک کے قول پر اللہ اور اس کے رسولؐ کے قول کو مقدم رکھے۔ ضرورت دینیہ میں یہ ایک معلوم امر ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۱)

واضح رہے کہ سعودی حکومت کے یہ سرکاری مفتی ابن باز صاحب حنبلی المسلک ہیں اور "طاغوت سے کنارہ کش ہو جاؤ" کے عنوان سے اتنا کچھ بیان کرنے کے بعد سعودی حکومت کی طرف سے حجاج کی رہنمائی کے لئے تقسیم کی جانے والی کتاب میں نبی ﷺ کو مدینے کی قبر میں زندہ مانتے ہیں اور اس وجہ سے وہاں شور و غل سے منع فرماتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے قول کو دوسروں کے قول پر مقدم نہ کرنے پر

آسمان سے پتھر برسنے کی بات کہنے والے یہی ابن باز صاحب اپنے پیش رو حنابلہ کے خلاف قرآن و سنت عقائد عود روح، عرض اعمال اور سماع موتی وغیرہ کے قائل ہیں۔

اسی سعودی حکومت جس کی سرپرستی میں ابن باز صاحب نے مندرجہ بالا باتیں لکھیں، کے ایک ممدوح محمد بن عبدالوہاب نجدی بھی تھے جنہوں نے قبروں پر تعمیر گنبد و مزارات ڈھانے میں خوب شہرت حاصل کی لیکن حکومتی سرپرستی میں قبریں زمین کے برابر کرنے کے حکم نبویؐ کی تعمیل کرنے والے نجدی صاحب جب گنبد خضریٰ پر پہنچے جو کہ نبی ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی میں آپ کی وفات کے سات سو سال بعد آپؐ کی قبر پر تعمیر کیا گیا تو نجدی صاحب نبی ﷺ کے قول کو سب پر مقدم نہ کر سکے اور کہہ اٹھے کہ فداک ابی و امی (میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں)۔ اس کے بعد سے آج تک یہ سعودی حکومت اس گنبد کی خادم ہے اور اس قدیم تعمیر کو استداد زمانہ اور موسمی اثرات سے بچانے کی نگہداشت، تزئین و آرائش پر زر کثیر صرف کرتی ہے۔ آج اس گنبد کی پرستش کی جاتی ہے، اس کی طرف رخ کر کے بڑے ہی خشوع و خضوع سے دعائیں کی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس طرف منہ اٹھا کر نفل بھی ادا کئے جاتے ہیں۔ الامان والحفیظ! کیا اس کے "خادم" کو نبی ﷺ کے حکم کی کوئی پرواہ نہیں؟ گو ان کی طرف سے کسی معلوم و معروف تعبدی فعل کا صدور نہیں ہوتا، تاہم اللہ کے رسول ﷺ جنہوں نے قبروں پر ہر قسم کی عمارت بنانے سے منع فرمایا اور انہیں مسمار کر کے زمین کے برابر کر دینے کا حکم دیا اور انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنانے والوں پر لعنت فرمائی، ان کی نافرمانی میں اس گنبد کو باقی رکھنے کے مساعی ہونے کی بنا پر کیا وہ اس کی پرستش میں پوری طرح حصہ دار نہیں؟

یہی نجدی صاحب جو اپنے آخری وقت میں یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

بای لسان اشکر اللہ انہ - لذو نعمۃ قد اعجزت کل شاکر
حبانی بالاسلام فضلا و نعمۃ - علی و بالقرآن نور البصائر
و بنعمۃ العظمی اعتقاد ابن حنبل - علیها اعتقادی یوم کشف السرائر

(مقدمہ کتاب التوحید، محمد بن عبدالوہاب نجدی، مطبوعہ نور محمد کتب خانہ آرام باغ، کراچی)

"میں کس زبان سے اللہ کا شکر کروں کہ وہ ایسا صاحب نعمت ہے کہ ہر شکر کرنے والا اس کے شکر سے عاجز ہے۔ اس نے مجھ پر فضل و نعمت فرماتے ہوئے اسلام عطا اور قرآن کا علم دیا جو آنکھوں کا نور ہے۔ اور سب سے بڑی نعمت ابن حنبل کا عقیدہ دیا یہی میرا عقیدہ اس دن ہوگا جب راز کھل جائیں گے۔"

اپنی اسی کتاب میں آدم و حوا علیہما السلام کو شرک سے متہم کر گئے۔ انہوں نے قرآنی آیت:

فلما اتهما صالحا جعلا له شركآء فيمآ اتهما، فتعلى الله عما يشركون ﴿۱۹۰﴾ (الاعراف-۱۹۰)

"جب اس نے ان دونوں کو ایک تندرست بچہ دیا تو انہوں نے اس کی اس عطا میں اس کا شریک مقرر کیا، سو اللہ ان کے شرک سے بلند تر ہے۔"

نقل کر کے غیر اللہ کی عبودیت کے نام مثلاً عبد عمر، عبد کعبہ وغیرہ رکھنا حرام قرار دیا۔ پھر اس آیت کی تفسیر میں ایک جھوٹی روایت کے ذریعے آدم و حوا علیہما السلام کو اس کا مصداق ٹھہرا کر لکھتے ہیں کہ

"جب حوا حاملہ ہوئیں تو شیطان نے آکر انہیں ڈرایا کہ تم اس بچے کا نام عبدالحارث رکھنا ورنہ میں اس کے بدو سینگ ہرن کی طرح بنا دوں گا پھر وہ تمہارا پیٹ چیرتا ہوا باہر آئے گا۔ اور انہیں ڈرایا کہ اس طرح کر دوں گا۔ ان دونوں نے اس کی اطاعت نہ کی۔ بچہ ہوا مگر مردہ۔ پھر دوبارہ حمل رہا تو شیطان نے پھر آکر ایسی ہی گفتگو کی۔ انہوں نے اس کی بات نہ مانی۔ بچہ پھر مردہ پیدا ہوا۔ تیسری بار جب وہ حاملہ ہوئیں تو شیطان نے آکر پھر اپنی بات دہرائی۔ اس دفعہ انہوں نے بچے کی محبت میں اس کا نام عبدالحارث رکھ دیا۔ یہی معنی ہیں جعلا له شركآء (انہوں نے اس کے شریک مقرر کئے) کے ...... اس کی بات ماننے میں شرک کیا، اس کی عبادت میں نہیں۔ (کتاب التوحید صفحہ ۱۴۳)

نجدی صاحب کو اتنی جرأت آخر کیوں نہ ہوتی جبکہ ان کے مقتداء و مطاع، متبوع و ممدوح، امام احمد بن حنبل صاحب جن کے عقیدے کو اختیار کرنے کو وہ مذکورہ بالا اشعار میں "نعمت عظمیٰ" کہہ رہے ہیں اور اسی پر یوم آخرت اٹھنے کے عزم کا اظہار فرما رہے ہیں، اپنی ضخیم مسند میں روایت لائے ہیں کہ آدم و حوا نے بچہ مر جانے کے خوف سے اس کا نام عبدالحارث رکھ دیا اور یہ سب شیطان کے حکم سے ہوا۔ ان ہی ابن حنبل اور ان کے متبعین ابن تیمیہ و ابن قیم کے قبر میں مردے کے زندہ ہو جانے، اپنے اعزہ کو پہچاننے، سننے، دیکھنے، دعا کرنے، زائرین قبر کی آواز سے خوش ہونے، روحوں کا اجتماع کرنے، وغیرہ کے خلاف قرآن و حدیث عقائد کا پیچھے ذکر کیا جا چکا ہے۔ اور عبدالوہاب نجدی کے صاحبزادے عبداللہ نے تو یہ تک کہہ دیا ہے کہ

"جس چیز کا ہم اعتقاد کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہمارے نبی ﷺ کا درجہ مطلقاً ساری مخلوق سے اعلیٰ ہے اور آپؐ اپنی قبر میں حیات دائمی کے ساتھ زندہ ہیں جو شہداء کی حیات سے اعلیٰ و ارفع ہے جس کا ثبوت قرآن کریم میں موجود ہے کیونکہ آپ بلاشبہ تمام شہداء سے افضل ہیں اور جو شخص آپؐ پر سلام پڑھتا ہے آپ اس کو سنتے ہیں۔" (اتحاف النبلاء صفحہ ۴۱۵)

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں کی زبانیں اس قسم کی خرافات قرآن و حدیث کی پیروی میں اگل رہی ہیں یا محض طاغوت پرستی میں۔

(۱۴) رسالہ "توحید الایمان" جسے شیخ عبداللطیف بن شیخ عبدالرحمن آل الشیخ نے تالیف کیا ہے اور محمد حامد الفقی، صدر جماعت انصار السنۃ المحمدیہ نے اس کی تصحیح و تعلیق کی اور ۱۳۷۲ھ مطابق ۱۹۵۳ء میں قاہرہ سے شائع ہوا سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس کے مطالعے سے طاغوت اور اس کی پیروی کے عمیق اثرات اور مسلک مناسکہ کا قوی اندازہ لگایا جا سکتا ہے

"جس نے کسی انسان کا مرتبہ نبی ﷺ سے اونچا کیا، اس نے کفر کیا۔ اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جس نے عثمان اور یوسف یا کسی صحابی یا کسی تابعی کا رتبہ آسمانوں اور زمین کے جبار، اللہ تعالیٰ (جس کی شان عظمت اور عظمت شان کے کیا کہنے) تک پہنچا دیا، وہ مسلمان رہے؟ جن لوگوں کو علی بن ابی طالب نے آگ میں جلوا دیا تھا، وہ اسلام ہی کے دعویدار تھے اور علی رضی اللہ عنہ کے ساتھی تھے اور صحابہؓ سے علم حاصل کر چکے تھے، لیکن انہوں نے علی رضی اللہ عنہ کو یوسف، شمسان اور ان جیسے دیگر افراد کی مثل جانا تھا (یہ قدیم نجد کے طاغوت تھے جن کی پرستش کی جاتی تھی) تو پھر صحابہؓ کا اسلام کے ان دعویداروں کے کفر اور ان کے قتل پر کیسے اجماع ہوا؟! کیا تم گمان کرتے ہو کہ صحابہؓ نے ان "مسلمانوں" کی تکفیر کی تھی؟ بنو عبید القداح جنہوں نے بنو عباس کے عہد میں مراکش اور مصر میں اپنی بادشاہت قائم کر لی تھی، سب کے

سب اپنی زبان سے لا الٰہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی شہادت دیتے تھے اور اسلام کے دعوے دار بھی تھے پانچ اوقات کی صلوٰۃ باجماعت اور جمعہ ادا کرتے تھے، اور جب انہوں نے شریعت کی مخالفت کا (طاغوتی) رویہ اختیار کیا تو علماء نے ان کے کفر اور ان کے ساتھ قتال پر اجماع کیا۔ ان کے بلاد کو بلاد الحرب قرار دیا اور ان سے جہاد کیا۔ انجام کار مسلمانوں کے ہاتھوں ان کے ممالک آزاد کرا لئے گئے۔"

(نواقض الایمان۔ صفحہ ۳۵،۳۶)

(۱۳) عبد القادر عودہ، مصر کے ہائی کورٹ کے جج تھے اور پورے مصر میں ایک مسلّم "ریسرچ اسکالر" کی حیثیت سے مشہور تھے۔ وہ اپنی کتاب "اسلام اور انسانی قانون" میں طاغوت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"پس جو کوئی اللہ اور اس کے رسول محمد ﷺ کی دی ہوئی ہدایت کے سوا کسی اور چیز سے اپنی زندگی کے معاملات میں فیصلہ طلب کرے گا تو طاغوت کو اپنا حاکم تسلیم کرے گا اور اس سے فیصلہ چاہے گا۔ اور طاغوت کہتے ہیں ہر اس چیز کو جو کہ بندے کی حد سے تجاوز ہو کر معبود یا متبوع یا مطاع کی حیثیت اختیار کرے۔ پس ہر قوم کا طاغوت وہی ہے جس کو وہ اللہ اور اس کے رسول کے مقابلے میں اپنا فیصلہ کنندہ سمجھیں یا اللہ کے سوا اس کی بندگی میں لگ جائیں یا اس کی اتباع بغیر کسی بصیرت کی آنکھیں بند کر کے کریں یا پھر اس کی پیروی اس طرح کریں کہ انہیں اس کا شعور نہ ہو کہ یہ در حقیقت اسی کی اطاعت ہے۔ پس جو کوئی اللہ پر ایمان لائے، اس کے لئے اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ غیر اللہ پر ایمان لائے، اور اللہ کے حکم کے سوا کسی اور حکم کو جائز قانون تسلیم کرے۔" (اسلام اور انسانی قانون۔ صفحہ ۶۶،۶۷)

(۱۴) محمد بن جمیل زینو نے طاغوت کی جن پانچ اقسام کا ذکر کیا ہے، اس کی مزید تشریح محمد بن سلیمان التمیمی نے اپنی کتاب "مبادی الاسلام" میں کی ہے، جس کا انگریزی ترجمہ Fundamentals of Islam کے نام سے ہو چکا ہے۔ انہوں نے طاغوت کی مختصر مگر جامع تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

معنی الطاغوت ما تجاوز به العبد حده من معبود او متبوع او مطاع

"طاغوت کے معنی ہیں جو بندہ اپنی حد سے تجاوز ہو جائے خواہ معبود ہو، متبوع ہو یا مطاع۔"

(مبادی الاسلام۔ صفحہ ۴۴)

(۱۵) "الهداية المستفيد" کے مؤلف العلامہ الشیخ عبد الرحمٰن بن حسن آل الشیخ نے طاغوت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"طاغوت ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کی اللہ کے سوا عبادت کی جائے۔ سب سے بڑا مسئلہ اس میں یہ ہے کہ جب تک طاغوت کا انکار نہ کیا جائے تب تک اللہ کی عبادت کا تصور ممکن نہیں۔" (الهداية المستفيد ترجمہ عطاء اللہ ثاقب۔ صفحہ ۵۵)

(۱۶) شاہ فہد پرنٹنگ کمپلیکس، سعودی عرب نے "مصحف المدينة النبوية" کے نام سے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے۔ اس میں زیادہ تر ترجمہ استاذ یوسف عبد اللہ علی کا رکھا گیا ہے۔ اس میں طاغوت کی تعریف میں لکھا ہے:

"Any thing worshipped besides Allah."

"ہر وہ چیز جس کی اللہ کے سوا بندگی کی جائے۔"

(مصحف المدينة النبوية: صفحہ ۱۱۶)

(۱۷) ڈاکٹر نصیر احمد ناصر اپنی "کتاب زندگی" مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، میں بعنوان "اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو" رقمطراز ہیں:

"یہ توحید ہے جو اصل دین ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دعوت توحید دینے کے لئے جملہ انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا جیسا کہ قرآن کی متعدد آیات جلیلہ سے ثابت ہے مثلاً: اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت (شیطانی قوتوں) سے بچو۔ (النحل) طاغوت سے مراد ہر وہ شیطانی قوت ہے جو انسان کو اس کے الٰہ (معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) اور رب (رزاق و پروردگار اور مالک و حاکم) سے جدا کر کے اللہ کے سوا دوسرے معبودوں کا بندہ و پرستار و مشرک بنا تی ہے۔ قرآن مجید کی زبان میں فرعون، ہامان، قارون اور آزر جو اولاد آدم کے دشمن ہیں، طاغوت کے زمرے میں آتے ہیں۔"

(کتاب زندگی۔ صفحہ ۴۱)

(۱۸) "مسائل الجاهلية" میں عراق کے علامہ السید محمد شکری آلوسی نے ضروری اضافہ کیا ہے۔ چنانچہ کتاب ھذا کے چوتھے ایڈیشن مطبوعہ قاہرہ ۱۳۹۸ھ میں علامہ موصوف نے "الايمان بالجبت والطاغوت" کے زیر عنوان لکھا ہے:

"جبت در اصل ایک صنم کا نام ہے جس کا اطلاق ہر معبود غیر اللہ پر ہوتا ہے اور طاغوت کا اطلاق باطل معبودوں میں سے ہر ایک پر ہوتا ہے اور ان دونوں پر ایمان کے معنی یا تو ان دونوں کے الٰہ ہونے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں دونوں کو اس کا شریک ٹھہرانے کے ہیں یا اس بات کی تصدیق کہ وہ دونوں معبود ہیں۔ جہاں تک ان دونوں کے درمیان قدر مشترک کا تعلق ہے تو وہ (مثال کے طور پر) تعظیم ہے۔ پہلے کے معنی سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں باطل معبودوں کی الوہیت کی تصدیق کرتے ہیں اور دونوں کو الٰہ الحق کی عبادت میں اس کا شریک ٹھہراتے اور سجدہ ریز ہوتے ہیں۔" (مسائل الجاهلية۔ صفحہ ۹۲،۹۳)

(۱۹) جبت اور طاغوت کے زمرے میں یقیناً اصنام بھی آتے ہیں کیونکہ ان کی بھی اللہ کو چھوڑ کر عبادت کی جاتی ہے۔ ان اصنام کے پیچھے "اشخاص و افکار" (انبیاء و اولیاء) ہوتے ہیں ورنہ سب سے بڑا بیوقوف آدمی بھی اس سے انکار کر دے اگر اس کے سامنے کوئی پتھر اٹھا کر اسے تراش خراش کر ایک صورت بنائے اور اسے "لو بھئی! یہ تمہارا معبود ہے، اس کو پوجو۔" اس ضمن میں "مسائل الجاهلية" کے مصنف نے "الايمان بالجبت والطاغوت" کے زیر عنوان سورۃ النساء کی زیر بحث آیت کے حوالے سے لکھا ہے:

"یہ آیت حیی بن اخطب اور کعب بن الاشرف کے معاملے میں نازل ہوئی۔ اس طرح کہ یہ لوگ غزوۂ احد کے بعد مکے گئے تاکہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف قریش کے حلیف بن جائیں اور اس عہد کو توڑ ڈالیں جو ان کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان تھا۔ کعب ابو سفیان کے ہاں ٹھہرا جہاں اس کی اچھی خاطر مدارت ہوئی۔ پھر یہود کا وفد قریش کے پاس آیا۔ اہل مکہ نے ان سے کہا "تم اہل کتاب ہو اور محمد (ﷺ) بھی صاحب کتاب ہیں۔ اور وہ اس بات پر یقین نہیں کریں گے کہ یہ تمہاری طرف سے ایک چال بھی ہو سکتی ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ہم محمد (ﷺ) کے خلاف تمہارے ساتھ نکلیں تو ان دو اصنام کو سجدہ کرو اور ان پر ایمان لے آؤ۔" کعب نے ایسا ہی کیا۔ پھر کعب بولا: "اے اہل مکہ! تیس نفوس تمہارے اور تیس ہمارے آئیں اور خانہ کعبہ میں چل کر رب البیت سے یہ عہد کریں کہ ہم محمد (ﷺ) کے ساتھ قتال میں ایک ساتھ جدوجہد کریں گے۔" انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اور جب اس عہد و پیماں سے فارغ ہوئے تو ابو سفیان نے کعب سے کہا: "تم کتاب پڑھنے والے ہو، اور ہم امی ہیں، بے علم ہیں۔ ہمیں بتلاؤ کہ ہمارے لئے سب سے زیادہ

ہدایت والا کون سا طریقہ ہے جو حق کے قریب ترین ہو، ہم یا محمد؟" کعب بولا: "میرے سامنے اپنا دین پیش کرو۔" اس پر ابوسفیان نے کہا: "ہم حاجیوں کے لئے جانور ذبح کرتے ہیں، انہیں دودھ پلاتے ہیں، مہمان کو گھر ٹھہراتے ہیں، صلہ رحمی کرتے ہیں، اپنے رب کے گھر کو آباد رکھتے ہیں اور اس کا طواف کرتے ہیں، اور ہم اہل حرم ہیں۔ جبکہ محمد (ﷺ) نے اپنے آبائی دین کو خیرباد کہہ دیا ہے اور اس نے قطع رحمی کی ہے۔ ہمارا دین قدیم اور محمد (ﷺ) کا دین جدید ہے۔" اس پر کعب نے کہا "اللہ کی قسم تم محمد (ﷺ) کی نسبت بہتر راہ ہدایت پر ہو۔" اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت مذکورہ نازل فرمائی۔ پس جبت در حقیقت ایک صنم کا نام ہے جو ہر غیر اللہ معبود کے لئے استعمال ہوتا ہے اور طاغوت کا اطلاق ہر باطل معبود و غیر دین ہوتا ہے۔" (ایضاً)

(۳۰) طاغوت کی تعریف کے تعین میں روزنامہ جنگ میں شائع ہونے والا سورۃ البقرہ کی آیت ۲۵۷ کا ترجمہ بھی بڑا معنی خیز ہے جسے "اولیاء الطاغوت" کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے:

"اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کے ساتھی (طاغوت) اکفر کرنے والی شیطانی قوتیں ہیں جو انہیں (ایمان کی) روشنیوں سے (کفر کی) اندھیروں کی طرف کھینچ کرلے جاتے ہیں۔ یہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے۔" (البقرۃ: ۲۵۷)

(روزنامہ جنگ راولپنڈی، ۷ اگست ۱۹۹۹ء۔ مسلسل قرآنی کالم)

(۳۱) دور جدید کے ایک مفسر امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر میں طاغوت کی تشریح اس طرح بیان کرتے ہیں:

"طاغوت بروزن ملکوت و جبروت طغی کے مادے سے ہے، جس کے معنی حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں۔ جو چیز اپنی حد مناسب سے آگے بڑھ جائے اس کے لئے عربی میں کہیں گے "طغی"۔ طغی الماء ۔ پانی حد سے آگے بڑھ گیا۔ قوم ثمود جس آفت سے ہلاک ہوئی اس کے لئے "طاغیہ" کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی حد سے بڑھ جانے والی آفت کے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ حدود عبدیت و بندگی سے نکل جانے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اور جو حدود بندگی سے نکل جائے اس کو "طاغوت" کہنے لگے۔ پھر وسعت اختیار کر کے یہ لفظ ان چیزوں پر بھی حاوی ہوگیا جو حدود بندگی سے نکل جانے کا باعث یا ذریعہ ہیں۔ اہل لغت اسی وجہ سے اس کی تشریح عام طور پر یوں کرتے ہیں کہ:

الطاغوت عبارۃ عن کل معتد وکل معبود من دون اللہ
(طاغوت سے مراد ہر وہ وجود ہے جو حد بندگی سے نکل جائے اور ہر وہ معبود ہے جس کی اللہ کے سوا پرستش کی جائے)۔" (تدبر قرآن، جلد ا، تفسیر سورۃ البقرۃ، صفحہ ۵۹۳)

(۳۲) طاغوت کی وضاحت کے سلسلے میں ابوالاعلیٰ مودودی اپنی تفسیر میں یوں رقمطراز ہیں:

"طاغوت لغت کے اعتبار سے ہر اس شخص کو کہا جائے گا جو اپنی جائز حدود سے تجاوز کر گیا ہو۔ قرآن کی اصطلاح میں طاغوت سے مراد وہ بندہ ہے جو اپنی بندگی کی حد سے تجاوز کر کے خود آقائی و خداوندی کا دم بھرے اور اللہ کے بندوں سے اپنی بندگی کرائے۔ اللہ سے منہ موڑ کر انسان ایک ہی طاغوت کے چنگل میں نہیں پھنستا بلکہ بہت سے طواغیت اس پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ ایک طاغوت شیطان ہے جو اس کے سامنے نئی نئی جھوٹی ترغیبات کا سبز باغ پیش کرتا ہے۔ دوسرا طاغوت اس کا اپنا نفس ہے جو اسے جذبات و خواہشات کا غلام بنا کر زندگی کے ٹیڑھے سیدھے راستوں میں کھینچے کھینچے لئے پھرتا ہے اور بے شمار طاغوت باہر کی دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بیوی، بچے، اعزہ، اقربا، برادری اور خاندان، دوست اور آشنا، سوسائٹی اور قوم، پیشوا اور راہنما، حکومت اور حکام، یہ سب اس کے لئے طاغوت ہی طاغوت ہوتے ہیں، جن میں سے ہر ایک اس سے اپنی اغراض کی بندگی کراتا ہے اور بے شمار آقاؤں کا یہ غلام ساری زندگی اسی چکر میں پھنسا رہتا ہے کہ کس آقا کو خوش کرے اور کس کی ناراضی سے بچے۔" (تفہیم القرآن، جلد ا، صفحہ ۱۹۶)

والذین اجتنبوا الطاغوت — (الزمر: ۱۷) کی تشریح میں مودودی صاحب لکھتے ہیں:

"طاغوت "طغیان" سے ہے، جس کے معنی سرکشی کے ہیں۔ کسی کو طاغی (سرکش) کہنے کے بجائے اگر طاغوت (سرکشی) کہا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ انتہائی درجے کا سرکش ہے۔ معبودان غیر اللہ کو طاغوت اس لئے کہا گیا ہے کہ اللہ کے سوا دوسرے کی بندگی کرنا تو صرف سرکشی ہے مگر جو دوسروں سے اپنی بندگی کرائے وہ کمال درجے کا سرکش ہے۔ طاغوت کا لفظ یہاں طواغیت یعنی بہت سے طاغوتوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اسی لئے ان یعبدوھا فرمایا گیا ہے۔ اگر واحد ہوتا تو یعبدوہ ہوتا۔" (ایضاً، جلد ۴، صفحہ ۳۶۹، حاشیہ ۳۵)

"حکومت و حکام" کو طاغوت کی فہرست میں شامل کرنے والے ہم نوا "جماعت اسلامی" کے بانی و مبانی کی مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں حکومت کے حصول کیلئے نصف صدی سے کی جانے والی پرزور بھرپور کوششوں پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے جس میں وہ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے اور اپنی امر والی میں کسی بھی ذریعے سے کام نہیں لیتے خواہ اسلامی شریعت کے احکامات کی پامالی پر ان کے نام کے ساتھ لگا "اسلامی" کا لاحقہ ان کا منہ ہی کیوں نہ چڑانے لگے۔ اقتدار کی اس بھوک میں انہوں نے ہر حد سے گزرنے اور طاغیانہ انداز اختیار کرنے میں کوئی تامل محسوس نہیں کیا بلکہ اس پر "جہاد" کا لیبل لگا کر اس کو عین "تقاضائے دین" اور "کار ثواب" قرار دیا (کَذٰلِكَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ) خواہ وہ ایوب خانی حکومت کے خلاف ایک عورت کو اقتدار میں لانے کی کوشش ہی کیوں نہ ہو جبکہ یہ فرمان رسول بھی ان کے پیش نظر ہو:

لَنْ یُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا اَمْرَهُمْ اِمْرَاَةً (بخاری، کتاب المغازی، باب کتاب النبی الی کسریٰ)
"وہ قوم ہرگز فلاح نہ پائے گی جو اپنا سربراہ ایک عورت کو بنالے۔"

اسلام پر فدا ہونے کے عزم کا اظہار کرنے والے تصوف کے بھی حوالے ہیں، جشن عید میلاد النبی بھی مناتے ہیں، احتجاجی مہم کے ترانوں میں موسیقی کا بھی بے محابا استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کے رہنما، حتیٰ کہ گود میں تو مولود کو لئے ہوئے احتجاجی جلسوں میں شرکت کرنے والی نقاب پوش خواتین بھی بلا کسی تردد آزادانہ تصویر کشی کراتے ہیں جنہیں اس سلسلے میں زبان رسالت سے سنائی جانے والی وعیدوں کا خیال تک نہیں آتا بلکہ اسے موجودہ دور سے ہم آہنگ و ضروری خیال کرتے ہیں۔ جمہور کی خوشنودی کے ذریعے سیاسی مفاد کے حصول کے لئے گیارہویں کی محافل اور غیر اللہ کے آستانوں پر حاضری و وہاں کی شرکیہ مراسم میں شرکت، یہاں تک کہ دستار بندی کرانے میں بھی کوئی قباحت محسوس نہیں کی جاتی!!

(۲۳) رسالہ "تقویۃ الایمان" جس کا ایک اقتباس صفحات گزشتہ میں دیا گیا ہے، کے مؤلف نے طاغوت کے ضمن میں مزید لکھا ہے:

"آج کے مشرکوں نے اپنے رئیسوں کو رسول اللہ ﷺ کے مرتبے سے بھی اونچا کر دکھایا ہے، جب انہوں نے ان کے شرک اور گمراہی میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت، ہدایت اور ایمان کے برعکس ان کی اطاعت کی۔ اور جب ان میں سے کسی کو کہا جاتا ہے کہ اللہ نے یہ فرمایا ہے اور اس کے رسولؐ نے یہ فرمایا ہے تو وہ غصے اور حسد کی آگ میں جل بھن کر کہتے ہیں:

"شعرانی، شاذلی، ابن عربی اور انہی جیسے طاغوتوں نے فرمایا۔"

جنھوں نے اللہ کی وحی کے مقابلے میں شیطانی وحی پیش کی۔ ان میں سے ہر ایک نے رسول اللہ سے حسد کا رویہ اپنایا اور مسلمانوں کے دلوں میں رسول اللہ ﷺ کی عظمت کا رخ ان طاغوتوں کی طرف پھیر دیا اور عامۃ المسلمین کو اپنے مذہب پر لانے میں کامیاب ہو گئے، کیونکہ لوگوں کی اکثریت کا یہ حال ہے کہ وہ اندھی تقلید کے مالک اور بے بصیرت ہوتے ہیں اور سوجھ بوجھ سے عاری ہوتے ہیں۔"

(کشف الشبہات: تقویۃ الایمان، صفحہ ۲۵ کا حاشیہ)

طاغوت کا رد

آج ہم انحطاط کے ایک ایسے دور سے گذر رہے ہیں جسے بجا طور پر طاغوتی دور کہا جاسکتا ہے۔ دنیا چھوٹے بڑے مختلف الانواع طواغیت سے معمور ہو چکی ہے۔ انسانیت کا گراف بڑی تیزی سے نیچے آگیا ہے۔ شاید اتنی ہی تیزی سے، جس کے ساتھ قیامت کی ہولناک گھڑی قریب آتی جا رہی ہے۔ اور ایسا ہونا ضروری بھی ہے کیونکہ یہ بدترین لوگوں ہی پر واقع ہوگی، جب طاغوت انتہا کو چھولے گا۔ انسانی معاشرے میں طغیان و تمرد کا غلبہ ہے اور یہ فی الواقع بڑی سرعت سے روبہ زوال و انحطاط ہے۔ مسلسل بڑھتے ہوئے طغیان و ہیجان نے معاشرے کو دہشت گردی اور انسانیت سوزی و درندگی کی انتہاؤں تک پہنچا دیا ہے۔ فحاشی و عریانی کے سیلاب میں قوم کا سفینۂ حیا ڈوب رہا ہے۔ اعلیٰ انسانی اقدار اسفل حیوانی اقدار میں بدل گئی ہیں۔ بلکہ اب تو انسانوں اور درندوں کا موازنہ کرنا درندوں پر بے جا الزام عائد کرنے کے مترادف ہے۔ بڑے دشمن انسان طاغوت نے چھوٹے بڑے طواغیت سے زمین کو بھر دیا ہے۔ دنیا کے دیگر مذاہب تو پہلے ہی طاغوت کے شکنجے میں تھے۔ ایک دینِ حق اسلام رہ گیا تھا، سو اس کا بھی محض ڈھانچہ رہ گیا ہے، گویا

ع مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

توحید کی جگہ شرک نے لے لی اور...... سنت کا مقام بدعت نے لے لیا اور

ع تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

دریں حالات در سنگئی احوال پر یہی بات صادق آتی ہے کہ

ع ایں خیال است و محال است و جنوں!

لیکن اللہ نے اپنی کتاب میں اپنے بندوں کو ایک پیغام یہ بھی دیا ہے کہ

"اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔" (الزمر: ۵۳)

"عالمِ طاغوت" سپردِ قرطاس کرنے کا واحد مقصد یہ ہے کہ عوام و خواص کو طاغوت کی مختلف شکلوں سے روشناس کرا کے اس سے مجتنب رہنے کی ترغیب دی جائے، جن کی غالب اکثریت کو طاغوتی قوتوں نے اپنے مذموم مقاصد کے لئے مختلف طریقوں سے یرغمال بنا رکھا ہے۔ مخصوص مفادات کی حامل ان قوتوں نے عوام کی اکثریت کو اپنے اپنے حلقۂ اثر میں رکھنے کے لئے انہیں کتاب و سنت کی تعلیمات کے برعکس مختلف مذہبی، سیاسی، علاقائی اور لسانی گروہ بندیوں میں تقسیم کر رکھا ہے، جہاں ان کو مست و مگن رکھنے کے لئے نت نئے مکر و فریب اور نفسیاتی حیلہ سازیوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اس طرح آج مختلف گروہوں، فرقوں اور مسالک کی صورت میں پائی جانے والی یہ تفرقہ بازی اور اس کی سرپرستی کرنے والی قوتیں فی الحقیقت طاغوتی کردار ادا کر رہی ہیں جبکہ عوام الناس کی اکثریت ان طواغیت کی پیروی کے جرمِ عظیم میں گرفتار ہے۔ ان میں سے ہر گروہ اپنے آپ کو كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (الروم: ۳۲) کے مصداق برحق سمجھتا ہے، حالانکہ اللہ کی کتاب نہ صرف یہ کہ تفرقہ بازی سے منع کرتی ہے بلکہ اس کو شرک سے تعبیر کرتی ہے (آل عمران: ۱۰۳، الروم: ۳۲)۔ اگر یہ تمام فرقے اپنے دعوائے ایمان و اسلام کے ساتھ حق پر ہوتے تو پھر ان سب کو مل کر ایک ہی قسم کا گروہ ہونا چاہیے تھا جس کے عقائد و اعمال میں کوئی تضاد و نزاع ہوتا اور نہ جدال و قتال۔ لیکن یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح سب پر عیاں ہے کہ ان میں سے کسی ایک فرقے کا امام ہو یا مقتدی، دوسرے فرقے کے امام و مقتدی کو قبول و گوارا نہیں کرتا۔ اس لئے کہ ان کے عقائد و اعمال میں زبردست اختلاف ہے اور ان کے درمیان ہر پایہ مسلسل محاذ آرائی اور روز افزوں سر پھٹول باہمی اتحاد اور اخوت و محبت کا مظاہرہ نہیں بلکہ انتشار بے کی نفرت و عداوت کا شاخسانہ ہے۔ یہ سب کچھ اللہ کے دین سے بغاوت کا نتیجہ ہے اور طاغوت ہی کے زیرِ احکام ہو رہا ہے۔ آج ملتِ مسلمہ کی تفرقہ پردازی اور گروہ بندی کا اصل سبب ان کے یہ احبار و رہبان ہی تو ہیں جن کے بارے میں اللہ کی کتاب نے پہلے ہی ہوشیار کر دیا تھا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ (التوبہ: ۳۴)

"اے ایمان والو! ان احبار و رہبان (مولویوں اور پیروں) کی اکثریت لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھا جاتی ہے اور انہیں اللہ کے راستے سے بھی روکتی ہے۔"

اس امت کی گمراہی اور بگاڑ میں ان کا بڑا حصہ ہے، چنانچہ طواغیت کی فہرست میں ان کا نمایاں مقام ہے۔

لاریب، اللہ کی کتاب کا فیصلہ ہے کہ ردِ طاغوت کے بغیر کوئی مومن نہیں ہو سکتا اور اس سے اجتناب کے بغیر اللہ کی بندگی کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اگر "ملتِ مسلمہ" کے نام سے معروف، انسانوں کا یہ انبوہِ کثیر جو متعدد طواغیت کی گرفت میں ہے، ہمت کر کے صرف اس ایک طاغوت "تفرقہ بازی و مسلک پرستی" کا سر پھوڑ دے اور احبار و رہبان کے ہم رنگ زمین جال سے خود کو آزاد کرا کے ان کی غلامی کا طوق اتار پھینکے اور یکسو ہو کر قرآن و حدیث کی ہدایت کی طرف رجوع کرے اور صحیح معنوں میں مسلم بن جائے تو ان کے درمیان اتحاد اور یکجہتی کا سنگِ بنیاد رکھا جا سکتا ہے، کیونکہ اس کے بعد اس مرکب طاغوت کے زیرِ اثر پرورش پانے والے کئی چھوٹے موٹے طواغیت خود ہی دم توڑ دیں گے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کھیل کے پیچھے سرگرم، دین میں بگاڑ پیدا کرنے والی ہلاکت خیز مثلث (اتحادِ ثلاثہ...... سلطانی و ملائی و پیری) کے آہنی بازو کمزور ہو کر شکست و ریخت کا شکار ہو جائیں گے۔ یوں انہیں آزادیٔ فکر و عمل کے نتیجے میں دینِ خالص کی طرف رہنمائی اور ردِ طاغوت کے ساتھ ایمانِ خالص کی توفیق ملے گی اور یہ...... ایمان ہی ایک ایسی بنیاد ہے جس پر صحیح معنوں میں اتحاد قائم ہو سکتا ہے۔ باقی صفحہ 39 پر

موسیٰ علیہ السلام

نسیم الدین خرم

اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ
(الاعراف: ۱۲۸)

"بے شک زمین اللہ کی ہے، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے اور آخرت کی کامیابی انہی کیلئے ہے جو اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کریں۔"

مالک الملک جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کرے، اس کی رحمت وسیع اور پکڑ شدید اور دردناک ہے۔ چشم فلک نے اس زمین پر بڑے عروج و زوال دیکھے ہیں اور قرآن میں ان کا ذکر بغرض نصیحت و عبرت کیا گیا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں جس قوم کے نشیب و فراز کا سب سے زیادہ ذکر ملتا ہے وہ ہے بنی اسرائیل یعنی اولاد یعقوب علیہ السلام۔

قرآن میں انبیاء علیہم السلام کا ذکر متعدد مقامات پر مختلف انداز میں کیا گیا ہے اور کہیں بعض انبیاء کی بعض پر فضیلت کا بھی ذکر ہے۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ (البقرۃ: ۲۵۳)

"یہ رسول، جن میں ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی، ان میں کوئی ایسا بھی تھا جس سے اللہ نے کلام کیا اور بعض کے درجات بلند کئے۔"

انہی برگزیدہ رسولوں میں اللہ تعالیٰ کے اولوالعزم پیغمبر موسیٰ علیہ السلام ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہم کلامی کا شرف عطا فرمایا اور صاحب شریعت رسول بنایا۔ موسیٰ علیہ السلام کی حیات طیبہ مجاہدانہ کشمکش اور شدید ترین آزمائش سے بھرپور ہے۔ ایک طرف آپؑ کے مدمقابل دین حق کا شدید مخالف اور وقت کا جابر و ظالم، متکبر اور طاقتور حکمران فرعون اور اس کی قوم ہے تو دوسری طرف آپؑ کی اپنی فاسق و فاجر قوم بنی اسرائیل ہے جو دنیا پرستی، خود غرضی اور ہر قسم کی مذموم صفات میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی ذمہ داری میں بنی اسرائیل کی رہنمائی و تربیت کے علاوہ ان کو فرعون کے جور و ستم اور غلامی سے چھٹکارا دلانا بھی شامل تھا۔ لیکن اس ناشکری اور احسان فراموش قوم نے اپنے نبی اور عظیم محسن کی نافرمانی بلکہ ایذا رسانی کو اپنا شعار بنایا ہوا تھا۔ قرآن میں ان کے اس طرز عمل کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اقوام عالم پر فضیلت دی، صدہا سال بنی اسرائیل میں پیہم انبیاء مبعوث ہوتے رہے، اور دنیاوی شوکت بھی ان کو بے انتہا دی گئی، لیکن اس قوم نے اللہ کی نعمتوں کی ناقدری اور کفران کی روش میں تمام قوموں کو پیچھے چھوڑ دیا! یہ بات قابل غور ہے کہ "فرعون" ایک متکبر کردار کی حیثیت سے ضرب المثل ہے جبکہ "یہودی" ایک بخیل، خود غرض اور زر پرست کی حیثیت سے بین الاقوامی سطح پر معروف! اب اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایسے حالات میں موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے احکامات بجا لانے اور نبوت کی ذمہ داری کو کماحقہ پورا کرنے میں جس صبر و تحمل اور عزم و جرأت کا ثبوت دیا وہ انہی جیسے اولوالعزم نبی کے شایان شان ہے۔

قرآن میں مذکور موسیٰ علیہ السلام کے واقعات کے مطالعے سے دعوت حق کے لئے اٹھنے والی تحریک اور مخالفین حق کے درمیان برپا کشمکش اور معرکہ آرائی کا ایک اثر انگیز منظر سامنے آتا ہے جو ان حالات سے قریبی مطابقت و مماثلت رکھتا ہے جو مکہ میں پیش آ رہے تھے۔ چنانچہ ان کے ذریعے ایک طرف تو اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان لانے والوں کی تقویت اور ان کے اطمینان قلب کا سامان فراہم ہوتا ہے تو دوسری طرف مخالفین کی معاندانہ کوششوں پر کاری ضرب پڑتی ہے، اس کے ساتھ ہی ان پر اتمام حجت کا مقصد بھی پورا ہوتا ہے کہ ایسے صریح اور چشم کشا تاریخی واقعات سے ذرا بھی سبق حاصل نہ کیا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن میں ان واقعات کا تذکرہ بے شمار مقامات پر کیا گیا ہے، کہیں موقع اور ضرورت کے لحاظ سے اجمالاً اور کہیں تفصیلاً، تاکہ صحابہ کرامؓ کی تربیت میں مدد ملے اور ان کے اندر صبر و استقامت کے اوصاف پروان چڑھیں۔ دعوتی نقطہ نظر سے اس کا ایک اور پہلو بھی اہم اور قابل غور ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا بنیادی مقصد الٰہ واحد کی بندگی کی دعوت اور طاغوت کی بندگی (عقیدت و محبت) سے اجتناب یعنی مکمل کنارہ کشی کی تلقین ہے، چنانچہ فرمایا:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ
(النحل: ۳۶)

"ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا اور لوگوں کو خبردار کیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو۔"

مصر کی زبردست طاغوتی قوت سے معرکہ آرائی موسیٰ علیہ السلام کے مشن کا اہم حصہ ہے جو بلاشبہ انتہائی سبق آموز اور عبرت انگیز ہے۔ اللہ کا نبی بغیر مادی قوت و وسائل کے

محض اللہ پر توکل کرتے ہوئے باطل قوت سے ٹکراتا ہے اور کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے یہ واقعات مکہ میں اٹھنے والی انقلابی تحریک کے لئے باعث تقویت اور حوصلہ افزا ہیں۔

بنی اسرائیل مصر میں

قرآن میں مذکور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام مع اپنے بھائیوں اور والدین کے مصر میں سکونت پذیر ہوگئے تھے اور وہاں اللہ نے ان کو بڑی عزت و تمکنت عطا فرمائی تھی۔ وقت گذرنے کے ساتھ اولادِ یعقوبؑ ایک بڑی قوم بن گئے اور بنی اسرائیل کے نام سے موسوم ہوئے۔ تاریخی شواہد سے یہ بھی ثابت ہے کہ یوسف علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیانی ادوار میں جو کئی صدیوں تک پھیلے ہوئے تھے، بنی اسرائیل مصر میں ہی قیام پذیر رہے۔ یوسف علیہ السلام کی وفات کے بعد مصر کی حکومت عمالقہ کے ہاتھ آئی اور ان کے اقتدار میں خوب وسعت ہوئی۔ ان حکمرانوں کا شاہی لقب "فرعون" تھا۔ شوکت و قوت کے نشے میں بدمست یہ حکمران بہت ہی متکبر اور ظالم و جابر ہوگئے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کا فرعون تو ظلم و جور میں انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ قرآن میں اس کو "فِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ" (میخوں والا فرعون) (الفجر: ۱۰) کہا گیا ہے۔ یہ شاید اس لئے کہ وہ میخوں کے ذریعے لوگوں کو ایذائیں دیتا تھا یا اس لئے کہ اس کے لشکر اتنے بڑے تھے کہ اگر وہ کہیں پڑاؤ ڈالتے تو حدِ نظر تک ان کے خیموں کی میخیں ہی نظر آتیں۔ قرآن میں اس کے لشکروں کا بھی ذکر کیا ہے (البروج: ۱۷، ۱۸)۔ الغرض، وہ سرکشی اور اپنی بڑائی کے زعم میں فساد فی الارض کی روش اختیار کئے ہوئے تھا (الفجر: ۱۱-۱۲)۔ لوگوں کو اپنی الوہیت کی پٹی پڑھاتا اور اعلانیہ خدائی کا دعویٰ کرتا:

فَقَالَ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ (النّزعٰت: ۲۴)

"اس نے کہا: میں تم سب کا اعلیٰ رب ہوں۔"

یہ بات یاد رہے کہ فرعون کا اپنے آپ کو الٰہ کہنا اس کے انتہائی متکبر ہونے کا ثبوت ہے، اسی لئے لفظ "فرعون" بطور محاورہ انتہائی متکبر کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس نفس پرست حاکم یعنی فرعون اور اس کی قوم نے بنی اسرائیل پر غلبہ حاصل کر کے انہیں غلام بنایا ہوا تھا اور وہ ان سے سخت مشقت لیتے تھے۔ بنی اسرائیل کی آبادی کو اللہ نے برکت عطا کی، اہلِ اقتدار کو خطرہ محسوس ہوا کہ وہ بغاوت کر کے ان سے اقتدار نہ چھین لیں۔ ابلیس نے ان کے اعمال انہیں مزین کر کے دکھائے اور یہ راہ سجھائی کہ وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ سختی سے تحدیدِ نسل (Population Control) کے منصوبے پر عمل کرایا جائے جس کے تحت بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کر دیا جائے اور ان کی لڑکیوں کو چھوڑ دیا جائے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس سلسلے میں فرعون کے خواب کا قرآن و حدیث میں کہیں ذکر نہیں ملتا لیکن بعض مفسرین و مورخین نے اسرائیلی روایات کے سہارے خواب کو بنیاد بنا کر آیاتِ ربانی کی تشریح کر ڈالی ہے۔ یہ انداز بہر حال قابلِ مذمت ہے۔ قرآن میں موسیٰ علیہ السلام کے واقعات کا ذکر بے شمار مقامات پر کیا گیا ہے۔ سورۃ القصص میں فرمایا:

طٰسٓمّٓ ﴿۱﴾ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ ۔۔۔ يَحْذَرُونَ ﴿۶﴾ (القصص: ۱ تا ۶)

"طا۔ سین۔ میم۔ یہ کتابِ مبین کی آیات ہیں۔ ہم موسیٰ اور فرعون کا کچھ حال ٹھیک ٹھیک تمہیں سناتے ہیں، ایسے لوگوں کے فائدے کے لئے جو ایمان لائیں۔ واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا، اس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور اس کی لڑکیوں کو جیتا رہنے دیتا تھا۔ فی الواقع وہ مفسد لوگوں میں سے تھا۔ اور ہم یہ ارادہ رکھتے تھے کہ مہربانی کریں ان لوگوں پر جو زمین میں ذلیل کر کے رکھے گئے تھے اور انہیں پیشوا بنا دیں، اور انہی کو وارث بنائیں اور زمین میں ان کو اقتدار بخشیں، اور ان سے فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں کو وہی کچھ دکھلا دیں جس کا انہیں ڈر تھا۔"

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک خاص منصوبے کا ذکر کیا ہے: جن محکوم لوگوں یعنی بنی اسرائیل کو اللہ کی زمین پر ذلیل اور پس ماندہ بنا رکھا گیا تھا ان پر نظرِ عنایت فرما کے ان کو عزت و سرفرازی اور اقتدار کے منصب سے نوازا جائے اور ظالم و جابر اور متکبر حکمرانوں یعنی فرعون اور آلِ فرعون کو ذلت و خواری سے دوچار کیا جائے اور دنیا والوں کیلئے عبرت نگاہی کا سامان بنا دیا جائے۔ سورۃ النّزعٰت میں اس بات کو اسطرح بیان کیا گیا:

فَأَخَذَهُ اللَّهُ نَكَالَ الْآخِرَةِ وَالْأُولَىٰ ﴿۲۵﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَن يَخْشَىٰ ﴿۲۶﴾ (النّزعٰت: ۲۵، ۲۶)

"آخر کار اللہ نے اسے دنیا اور آخرت کے عذاب میں پکڑ لیا۔ درحقیقت اس میں بڑی عبرت ہے اس کے لئے جو ڈرے۔"

تاریخِ انسانیت پر اگر قرآن کی روشنی میں نظر ڈالی جائے تو قوموں کے عروج و زوال میں ربِ ذوالجلال کا کوئی منصوبہ کار فرما نظر آتا ہے۔ چنانچہ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آلِ عمران کے گھر کو منتخب فرمایا۔ عمران موسیٰ علیہ السلام کے والد تھے اور ان کے علاوہ ان کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہارون بھی تھا۔ قرآن میں موسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور بچپن کے واقعات کو متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے جن کا مختصر خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔ فرعونیوں نے انتہائی سفاکی اور چالاکی سے بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرنا شروع کر دیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کی ولادت بنی اسرائیل کے ایک گھر میں ہوئی اور موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور دوسرے گھر والے اس صورتحال سے سخت پریشان تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کے شر سے محفوظ رکھا۔ پیدائش کے بعد ان کے گھر والوں نے کسی نہ کسی طرح چند ماہ تو گذارے لیکن جب حالات کی شدت اور ام موسیٰؑ کی پریشانی حد سے زیادہ بڑھ گئی اور قریب تھا کہ وہ راز فاش کر دیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ڈھارس بندھائی اور الہام کیا کہ ایک تابوت نما صندوق میں بچے کو رکھ کر دریا کے بہاؤ پر چھوڑ دو، وہ اس کو کنارے پر پہنچا دے گا اور غمگین نہ ہو، ہم اس کو پھر تمہاری طرف پہنچا دیں گے اور اس کو رسول بنائیں گے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور ساتھ ہی اپنی بیٹی کو پیچھے لگا دیا کہ صندوق پر نظر رکھے۔ اللہ کی مشیت کے مطابق وہ فرعون کے محل تک پہنچا اور آلِ فرعون نے اس کو نکال لیا۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام میں خاص محبت ڈال دی یعنی ایسی شکل و صورت عطا فرمائی کہ ان کو دیکھتے ہی بے اختیار پیار آ جائے۔ اسطرح وہ فرعون کی بیوی کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنے جس نے فرعون کو ان کے قتل سے باز رکھا اور کہا کہ "یہ میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اسے قتل نہ کرو۔۔۔" (القصص ۷، ۸، ۹ تا ۲۹)۔ قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ زوجہ فرعون آسیہؑ ایک مومنہ و صالحہ خاتون تھیں جن کا ذکر قرآن (سورۃ التحریم ۱۱) اور حدیث (صحیح بخاری کتاب الانبیاء) میں بڑی تکریم سے کیا گیا ہے۔

الغرض، اللہ تعالیٰ نے خاص اہتمام اور اپنی نگرانی میں موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کرائی، ان کے دشمنوں، آلِ فرعون سے ہی ان کی حفاظت کرائی اور بچے پر غیر عورت کا دودھ حرام کرکے ان کی ماں کے ذریعے ہی ان کی رضاعت کا اہتمام کرکے ان سے کیا ہوا وعدہ پورا کردیا (القصص ۲۸:۱۳)۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا شاہکار تھا۔ شاہی محل کے عیش و عشرت سے بھرپور ماحول میں پروان چڑھنے کے باوجود موسیٰ علیہ السلام کو دنیا پرستی سے دور رکھا اور عیش اندازِ اختیار کرنے سے بچایا جس میں آلِ فرعون بُری طرح مبتلا تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جسمانی قوت و شجاعت اور پُررعب اور باوقار شخصیت کے ساتھ عقل و دانش اور علم و حکمت سے بھی نوازا تھا (القصص ۲۸:۱۴)۔

قبطی کا قتل اور مصر سے خروج

موسیٰ علیہ السلام کو سنِ شعور کو پہنچنے تک یہ اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ فراعنہ سے ان کا رشتہ و قرابت نہیں بلکہ وہ بنی اسرائیل میں سے ہیں۔ چنانچہ ان کے اندر بنی اسرائیل کی غلامی اور ذلت و بدحالی پر غم و غصہ کے ساتھ ان کی حمایت کا جذبہ ہونا ایک فطری امر تھا۔ ایک مرتبہ وہ شہر میں ایسے وقت گھوم رہے تھے جبکہ اہلِ شہر ابھی غفلت ہی میں تھے یعنی اپنے معمولات کے لئے باہر نہ نکلے تھے اور سڑک پر سناٹا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک اسرائیلی اور قبطی کا آپس میں جھگڑا ہو رہا ہے۔ اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام سے مدد چاہی۔ اللہ کے نیک اور صالح بندے ہمیشہ ہی مظلوم کی مدد کرنے اور ظالم کو ظلم سے باز رکھنے کو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے مصری کو ظلم و جور سے باز رکھنے کی کوشش کی اور بیچ بچاؤ کیا۔ اس کوشش میں غیر ارادی طور پر اس ظالم قبطی کے ایک گھونسہ رسید کردیا۔ وہ اس کی تاب نہ لاسکا اور ہلاک ہوگیا۔ آپ کو اس فعل پر سخت ندامت ہوئی، اس کو شیطانی عمل قرار دیا اور اعترافِ گناہ کے شدید جذبے کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں معافی کے خواستگار ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی خطا کو معاف فرمادیا:

قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ﴿﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ ۚ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿﴾

(القصص ۱۵، ۱۶)

"موسیٰ نے کہا کہ یہ شیطان کی کارفرمائی ہے، بلاشبہ وہ دشمن صریح گمراہ کرنے والا ہے۔
پھر اس نے عرض کیا کہ اے میرے رب! میں نے اپنے اوپر ظلم کیا، مجھے معاف فرمادے۔
پس (اللہ نے) اس کی مغفرت فرمادی، وہ غفور و رحیم ہے۔"

یہ بات قابلِ غور ہے کہ بتقاضائے بشریت اللہ کے نیک بندوں سے بھی غلطی کا احتمال ہے، لیکن اگر صالح و متقی بندوں کی شان ہے اعترافِ گناہ اور بارگاہِ ربانی میں عاجزانہ استغفار، تو ربِ کریم کی شان ہے مغفرت اور عفو و درگذر۔ توبہ و استغفار میں اخلاص کا یہ بھی تقاضا ہے کہ آئندہ اس غلطی کے نہ کرنے کا عزم ہو۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے یہ عہد کیا کہ

فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ (القصص ۱۷)

"(آئندہ) میں ہرگز مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا۔"

شہر میں مصری کے قتل کی خبر تو مشہور ہوئی لیکن کوئی چشم دید گواہ نہ تھا سوائے اس اسرائیلی کے جس کی مدد کی گئی تھی۔ دوسرے روز صبح موسیٰ علیہ السلام پھر خوف کی کیفیت لئے ہوئے محتاط انداز میں شہر میں نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہی اسرائیلی کسی دوسرے قبطی سے لڑ رہا تھا اور مدد کیلئے موسیٰ علیہ السلام کو پکار رہا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے احساسِ ناگواری کے ساتھ اس سے کہا "تو واضح بہکا ہوا ہے"۔ یعنی ہر ایک سے جھگڑا کرتا اور پھر فریاد کرتا ہے۔ یہ کہہ کر موسیٰ علیہ السلام نے اس کو چھڑانے اور قبطی کو پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اسرائیلی ان الفاظ کی وجہ سے یہ سمجھا کہ آپ اس کو مارنے کے لئے بڑھ رہے ہیں۔ چنانچہ اس احسان فراموش نے خبثِ باطن سے شرارت کے انداز میں راز فاش کردیا اور کہنے لگا کہ کیا تم مجھے بھی اسی طرح قتل کرنا چاہتے ہو جس طرح تم نے کل ایک شخص کو ہلاک کردیا تھا۔ تم تو ملک میں جابر بن کر رہنا چاہتے ہو اصلاح کرنا نہیں چاہتے۔ مصری نے یہ بات سن کر اربابِ اختیار کو مطلع کردیا کہ اس مصری کا قاتل موسیٰ ہے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری و قتل کے احکامات جاری ہوئے۔ ایک معزز مصری نے جو موسیٰ علیہ السلام کا خیر خواہ تھا، فوراً آکر موسیٰ علیہ السلام کو خبر دی کہ سردار تمہارے قتل کے مشورے کررہے ہیں، لہٰذا تم یہاں سے نکل جاؤ۔ موسیٰ علیہ السلام اس کے مشورے کے مطابق خوف و اندیشے کی حالت میں مصر سے نکل کھڑے ہوئے اور اللہ سے دعا کی کہ ظالموں سے نجات دے (القصص ۲۱:۱۸)۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ اللہ کو اپنے منصوبے کے تحت شاہی محل کے عیش و آرام کے ماحول میں پروان چڑھنے والے موسیٰ کو اب ایک عظیم مشن کیلئے تیار کرنا ہے، چنانچہ تحمل و بردباری، غور و فکر اور مستقل مزاجی کے ساتھ اللہ پر توکل کے اعلیٰ ترین اوصاف سے آراستہ کرنے کیلئے مصائب و آزمائشوں کے مراحل سے گذارنا ضروری ہے۔ اب اس کی ابتداء ہو چکی ہے۔

الغرض، مصر سے نکل کر مدین کا رخ کیا کیونکہ اہلِ مدین کی موسیٰ علیہ السلام سے کچھ قرابت تھی اور مدین فرعونی مملکت سے باہر ایک آزاد علاقے کے طور پر تھا لہٰذا فرعون کی دسترس سے باہر تھا اور وہاں موسیٰ کو کسی گرفتاری کا اندیشہ نہ تھا۔ ہنگامی طور سے اچانک سفر پر نکلنا پڑا، نہ کوئی تیاری، نہ زادِ راہ۔ شاہی محل کے عشرت کدے میں پرورش پانے والے کیلئے اب سخت دشوار گذار سفر کی صعوبتیں درپیش تھیں لیکن جب اللہ ہی پر توکل ہو تو سب کچھ آسان ہو جاتا ہے:

قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿﴾ (القصص ۲۲)

"امید ہے کہ میرا رب مجھے ٹھیک راستے پر ڈال دے گا۔"

موسیٰ علیہ السلام مدین میں

بھوک اور پیاس کے عالم میں مصائب پر مصائب جھیلتے ہوئے طویل مسافت طے کرکے ارضِ مدین میں قدم رکھا تو دیکھا کہ کنوئیں کے سامنے بہت سے لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں اور ان سے الگ دو عورتیں اپنے جانوروں کو روکے ہوئے کھڑی ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا اور افسوس بھی کہ مردوں کو عورتوں کی بے بسی اور مجبوری کا کوئی احساس نہیں۔ دریافت کرنے پر عورتوں نے بتایا کہ ان کے والد بہت بوڑھے ہیں اور مردوں کی موجودگی میں وہ اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلاسکتیں۔ ایک غور و فکر کرنے والے حساس قلبِ سلیم کے لئے یہ چھوٹے واقعات بھی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان میں نصیحت و عبرت کا سامان ہوتا ہے۔ قدرت قلبی کا شکار قوی اور سرکش لوگوں کے جانوروں کے لئے صاف و شفاف پانی اور بے بس، کمزور

عورتوں کے جانوروں کے لئے بچا کھچا گدلا پانی اور وہ بھی انتظار بسیار کے بعد! عدل و انصاف سے خالی وعاری خطہ زمین پر ظلم و جبر کا یہی قانون رواں دواں ہے۔ موسیٰ علیہ السلام جیسے صالح اور عزم و ہمت کے پیکر کے لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ مظلوم کی بے بسی اور حق تلفی دیکھیں اور جنبش نہ کریں۔ آپ فوراً آگے بڑھے، بھیڑ میں گھس کر لڑکیوں کے مویشیوں کو پانی پلایا، پھر قریب ہی ایک درخت کے سائے میں جا بیٹھے۔ مسافرت، غربت اور بھوک و پیاس کے شدید احساس کے ساتھ اپنے رب کی طرف رجوع کیا اور دعا کی:

رَبِّ اِنِّی لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ○ (القصص:۲۴)

"اے میرے رب! جو خیر تو میری طرف نازل فرمائے، میں اس کا محتاج ہوں۔"

یہ ایک پریشاں حال لیکن پاکباز مرد مومن کے دل کی پکار تھی جو بارگاہ ربانی میں قبول ہوئی اور کمزور لڑکیوں کی جرا تمندانہ حمایت اُن کے والد شیخ مدین تک پہنچنے کا سبب بنی۔ اُن لڑکیوں نے جو اس باوقار و باکردار شخص کی سیرت و کردار سے متاثر ہو گئی تھیں، اپنے والد سے اس کے اس احسان کا ذکر کیا تو انہوں نے فوراً ان کو بلوایا۔ تھوڑی ہی دیر میں ان میں سے ایک لڑکی شرم وحیا سے چلتی ہوئی موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئی اور کہنے لگی: "میرے والد آپ کو بلا رہے ہیں تاکہ آپ نے جو ہماری مدد کی ہے اس کا معاوضہ آپ کو دیں۔" موسیٰ علیہ السلام نے اس موقعے کو اللہ کی بارگاہ میں قبولیت کا نتیجہ سمجھتے ہوئے وہاں جانے کا ارادہ کر لیا اور وہاں جا کر ان بزرگ کو اپنا پورا واقعہ سنایا۔ انہوں نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ اب کوئی خوف و اندیشے کی ضرورت نہیں، اللہ نے ظالموں سے آپ کو بچا لیا ہے (القصص:۲۵)۔ یہ بزرگ کون تھے؟ اس پر مورخین و مفسرین نے ضعیف و ناقابل احتجاج روایات کی بنیاد پر کافی بحث کی ہے لیکن درست موقف یہی ہے کہ قرآن و صحیح حدیث میں ان بزرگ کے نام کی کوئی وضاحت نہیں، اس لئے اس کی کھوج کرنا لاحاصل ہے۔

الغرض، اُن بزرگ نے موسیٰ علیہ السلام کے سیرت و کردار سے متاثر ہو کر انکو مہمان بنایا اور پھر اپنی ایک بیٹی کے نکاح کی پیشکش اس شرط پر کی کہ وہ آٹھ سال تک انکے یہاں کام کی ذمہ داری سنبھالیں اور اگر رضا و رغبت دس سال پورے کریں تو یہ انکی مرضی۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کو قبول کر لیا (القصص ۲۸،۲۷)۔ موسیٰ علیہ السلام نے وہاں طے شدہ مدت میں قیام کیا اور بکریاں چرائیں۔ بخاری کی روایت کے مطابق موسیٰ علیہ السلام نے دس سال کی مدت پوری کی (صحیح بخاری کتاب الشہادات باب من امر بانجاز الوعد)۔

منصب رسالت پر سرفرازی

مقررہ مدت پوری کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام اہل و عیال کو لے کر مدین سے چلے۔ سردی پڑ رہی تھی، موسیٰ علیہ السلام نے گھر والوں سے کہا کہ اگر کوئی ایسا شخص نہ ملا جو راستہ بتا سکے تو میں آگ لاؤں گا تاکہ اسے روشن کر لو (صحیح بخاری کتاب التفسیر سورہ طہٰ)۔ قرآن میں یہ واقعہ کئی مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ القصص میں اس طرح منظر کشی کی گئی ہے:

فَلَمَّا قَضٰی مُوْسَی الْاَجَلَ وَ سَارَ بِاَهْلِهٖٓ ... وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ○ (القصص ۲۹ تا ۳۵)

"موسیٰ علیہ السلام مدت پوری کر کے اہل و عیال کے ساتھ مدین سے چلے تو طور کی جانب ان کو آگ نظر آئی۔ گھر والوں سے کہا کہ ٹھہرو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے، شاید میں وہاں سے کچھ خبر لے آؤں یا آگ کا انگارہ اٹھا لاؤں جس سے تم تاپ سکو۔ جب وہ وہاں پہنچے تو وادی کے داہنے کنارے پر مبارک خطے میں ایک درخت سے پکارا گیا کہ اے موسیٰ! میں ہی اللہ رب العالمین ہوں، اور یہ کہ تم اپنی لاٹھی پھینکو۔ جونہی کہ وہ لاٹھی ڈالی گئی موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ وہ سانپ کی طرح بل کھا رہی ہے تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے اور مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ (حکم ہوا کہ) موسیٰ پلٹ آؤ اور خوف نہ کرو، تم بالکل محفوظ ہو۔ اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالو، وہ چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے۔ اور خوف سے بچنے کے لئے اپنا بازو بھینچ لو۔ یہ دو نشانیاں ہیں تمہارے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے پیش کرنے کے لئے، وہ بڑے ہی نافرمان لوگ ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے رب! میں نے ان کا ایک آدمی قتل کیا ہے، ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے مار ڈالیں گے، اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہے، اسے میرے ساتھ بطور مددگار بھیج تاکہ وہ میری تائید کرے، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ مجھے جھٹلائیں گے۔ فرمایا: ہم تمہارے بھائی کے ذریعے تمہارے بازو کو مضبوط کریں گے اور تم دونوں کو غلبہ دیں گے اور وہ تم تک نہ پہنچ سکیں گے (تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے)۔ ہماری نشانیوں کے ساتھ تمہیں اور تمہاری پیروی کرنے والوں ہی کو غلبہ ہوگا۔"

(مزید تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو سورۃ النمل، آیات ۷ تا ۱۲ / سورۃ طہٰ آیات ۱۰ تا ۳۶)

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندے کو اس عظیم مشن کیلئے منتخب فرمایا۔ ابتداءً آپ کو شہر کے مصنوعی تمدن اور پرتعیش ماحول سے نکال کر دیہات کی فطری اور پرمشقت فضا میں آپ کی تربیت فرمائی، پھر طور کی وادی میں "قَرَّبْنٰهُ نَجِیًّا" کے شرف سے نوازا۔ اس ابتدائی تربیت کے بعد آپ کو کچھ خصوصی نشانیاں معجزات کی شکل میں عطا کیں اور حکم دیا:

اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ○ (طہٰ:۲۴)

"تم فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو گیا ہے۔"

درج بالا آیات اُس مقدس وادی طویٰ کا منظر پیش کرتی ہیں جہاں یہ واقعہ ظہور میں آیا۔ اس سنسان وادی میں رب ذوالجلال والاکرام اپنے بندے کو ہمکلامی کا شرف عطا فرماتا ہے۔ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ مالک حقیقی سے محبت، عقیدت اور جذبہ تشکر سے سرشار قلب و ذہن میں اپنے آقا سے اس یکایک ہنگامی قربت کے احساس نے کیسا تلاطم برپا کر دیا ہوگا! یہ پرہیبت ماحول اور رب کی خشیت ہی انسان کو لرزا دینے اور خوف و وحشت سے رونگٹے کھڑے کر دینے کیلئے کافی ہے، پھر ایک بھاری ذمہ داری کا احساس قلب و ذہن میں رقت طاری کر دیتا ہے۔ اب تک محض ایک خاندان کے معاملات کی ذمہ داری پوری کرنی تھی اور کچھ مویشیوں کے ریوڑ کی گلہ بانی، لیکن اب تو کار جہانبانی سونپا جا رہا ہے، ایک عظیم الشان سلطنت کے جابر و متکبر حکمراں کی سرکشی اور باغیانہ روش کی اصلاح کا مشکل و دشوار گذار مشن سپرد کیا جا رہا ہے۔ نبوت کی ذمہ داری و بنی نوع انساں کی رہنمائی کوئی معمولی کام تو نہیں، موسیٰ علیہ السلام کو (بحیثیت بشر) اپنی کم مائیگی و کمزوریوں کا شدید احساس ہے جس کا اظہار درج بالا آیات میں کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو تسلی دی اور اُن کے بھائی ہارونؑ کو اُن کا معاون بنا دیا اور فرعونیوں پر غلبے کی یقین دہانی کرائی۔ تاہم پیغمبرانہ مشن سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت کے حصول کیلئے اور اس انتہائی مشکل کام کو آسان بنانے کیلئے وہ اپنے مالک حقیقی ہی سے التجا کرتے ہیں:

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ﴿﴾ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ﴿﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِنْ لِسَانِي ﴿﴾ يَفْقَهُوا قَوْلِي ﴿﴾ (طٰہٰ:۲۵تا۲۸)

"موسیٰ نے کہا کہ اے میرے رب! میرا سینہ میرے لئے کھول دے، اور میرے کام کو میرے لئے آسان کردے، اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ میری بات سمجھیں۔"

موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ اپنے رب سے طلب کیا وہ سب وہی تھا جو اس اہم مشن کے لئے ان حالات میں ضروری تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ نبی کی ہر درخواست اسی وقت منظور کی:

قَالَ قَدْ أُوتِيتَ سُؤْلَكَ يَا مُوسَىٰ ﴿﴾ (طٰہٰ:۳۶)

"فرمایا کہ تمہیں دیا گیا جو تم نے مانگا اے موسیٰ۔"

یہاں ایک لمحہ ٹھہر کر اس اہم پہلو پر غور کر لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ جن بندوں کو اپنے کام کے لئے منتخب فرماتا ہے ان کو اپنے مشن کی تربیت کے مقصد اور درجات کی بلندی کے لئے شدید صبر آزما مصائب و آلام سے دوچار کراتا ہے، ان کو شیطانی و طاغوتی قوتوں بلکہ پورے ہی معاشرے کی مخالفتوں اور مزاحمتوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے لہٰذا خصوصی قربت و نگرانی اور گاہے گاہے غیبی تائید و نصرت کے وعدے ان کی تقویت قلب کیلئے از حد ضروری ہوتے ہیں۔ سورۃ الفرقان میں اپنی اسی سنت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ ۗ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ هَادِيًا وَنَصِيرًا ﴿﴾ (الفرقان:۳۱)

"اور اسی طرح ہم نے مجرموں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے۔ اور ہدایت و مدد کے لئے تمہارا رب ہی کافی ہے۔"

یہاں ایک اور بات بھی قابلِ وضاحت ہے۔ سورۃ طٰہٰ کی درج بالا آیات میں موسیٰ علیہ السلام نے "سینہ کھول دے" اور "زبان کی گرہ کھول دے" کی بھی دعا فرمائی ہے۔ شرح صدر یا وسعت قلب سے مراد قلب و ذہن کا نورِ ہدایت سے منور ہونا ہے۔ سورۃ الزمر میں فرمایا:

أَفَمَنْ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِنْ رَبِّهِ ۚ (الزمر:۲۲)

"(کیا وہ اس شخص کا) جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا اور وہ اپنے رب کی طرف سے روشنی پر ہے۔"

شرح صدر کے بعد داعیِ حق اللہ کے منصوبے اور مشیت کے مطابق جادۂ حق کا مسافر بن جاتا ہے، اور بے راہ رو معاشرے کے دھارے کا رخ پھیرنا اس کی زندگی کا نصب العین قرار پاتا ہے۔ پھر اس راہ کے مصائب و مشکلات برداشت کرنا اور قربانیاں دینا اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔ "زبان کی گرہ کھولنا" یہ محاورہ ہے جس کا مفہوم ہے فصیح البیانی کے لئے خیالات و الفاظ کی روانی و سلاست، اور خطابت کی ایسی صلاحیت کہ بڑے سے بڑے مجمع میں بے دھڑک مؤثر انداز میں اظہار خیال کر دیا جائے۔ اس کی تائید مذکورہ قول سورۃ القصص کی آیت ۳۴ سے بھی ہوتی ہے جس میں موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی کہ میرا بھائی مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہے اس کو معاون بنا دے۔ اس سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے فصیح البیان ہونے ہی کی بلندی درخواست کی ہے۔ سورۃ الشعراء میں آپ کی دعا کے الفاظ ہیں "میرا سینہ تنگ ہوتا ہے اور میری زبان ساتھ نہیں دیتی۔" (الشعراء:۱۳) لیکن افسوس کہ مفسرین ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں اور سادہ سے الفاظ کو اپنی عادت اور ذوق کے مطابق افسانوی رنگ دے کر کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں۔ یہاں بھی "وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِنْ لِسَانِي" کی تاویل و تفسیر کے لئے ایک گھڑی ہوئی حکایت کا سہارا لیا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے بچپن میں ایک دفعہ آگ کا انگارہ اٹھا کر منہ میں رکھ لیا تھا جس سے زبان پر نشان پڑ گیا اور زبان موٹی ہو گئی! اس ضمن میں طرح طرح کی "نکتہ سنجیاں" اور موشگافیاں کی گئی ہیں جو قطعاً لایعنی اور غیر ضروری ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ کا نبی ہر قسم کے عیوب اور جسمانی نقائص سے پاک ہوتا ہے، اس کی شخصیت باوقار، بارعب اور پرکشش ہوتی ہے۔ اسرائیلی علماء تو اپنے انبیاء کو ہمیشہ ہی مطعون کرتے رہے اور مختلف گھڑے ہوئے الزامات کا ہدف بناتے رہے۔ کہاں کی دانشمندی ہے کہ انہی کی روایات کو جواز بنا کر نبی کی شخصیت کو نشانہ بنایا جائے۔ نعوذباللہ من تلک الخرافات! درست موقف وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے "زبان کی گرہ کھول دے" کے بامحاورہ الفاظ کے ذریعے اپنے منصب اور ذمہ داری کے لحاظ سے فصیح البیان ہونے کی دعا کی ہے، اور مصر کے حالات کے تحت اپنے بھائی کو معاون بنانے کی درخواست بھی کی۔ اللہ تعالیٰ نے دعا کو قبول فرمایا اور ہارون علیہ السلام کو بھی نبی بنا دیا۔

الغرض، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی درخواست قبول کر لی اور عزم و ہمت کو بڑھانے کیلئے اپنے پچھلے احسانات یاد دلائے کہ جس طرح اللہ کی غیبی تائید و نصرت تمہاری زندگی کے ہر مرحلے میں شاملِ حال رہی ہے وہ اب بھی رہے گی اور تم دشمن کی چالوں اور سازشوں سے محفوظ رہو گے۔ پچھلے واقعات یاد دلانے کے بعد فرمایا:

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي ﴿﴾ اذْهَبْ أَنْتَ وَأَخُوكَ بِآيَاتِي (طٰہٰ:۴۱،۴۲)

"میں نے تمہیں اپنے (کام کے) لئے منتخب کر لیا ہے، تم اور تمہارا بھائی میری نشانیوں کے ساتھ جاؤ۔"

ساتھ ہی راہِ حق کے مجاہد کے لئے کچھ "زادِ راہ" ان حالات کی مناسبت سے کچھ زریں اصول بطور نصیحت عطا کئے:

وَلَا تَنِيَا فِي ذِكْرِي ﴿﴾ اذْهَبَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ﴿﴾ فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَيِّنًا لَعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ ﴿﴾ (طٰہٰ:۴۲تا۴۴)

"تم دونوں میری یاد میں سستی نہ کرنا۔ تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اس سے نرمی سے بات کرنا شاید وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے۔"

اللہ کا ذکر اور یاد ہی تو ہر مومن، خصوصاً داعیِ حق کی زندگی کا سرمایہ ہے۔ اللہ کے برگزیدہ نبی کا تو کہنا ہی کیا۔ لیکن پھر بھی، عوامی مشن کے لئے تربیت اور تکمیل شعور کے آخری مرحلے میں نبوت کی اہم ذمہ داری سونپتے ہوئے یہ دو زریں اصول خاص طور سے واضح کئے گئے:

(۱) اللہ کے ذکر میں کمی نہ ہو

(۲) دعوت میں نرم انداز اختیار کیا جائے

داعیِ حق جس اسلحے کے ساتھ دعوت کے میدان میں اترتا ہے وہ صبر و استقامت اور اللہ پر توکل کی جوہری صفت ہے۔ اللہ کا ذکر (صلوٰۃ، تلاوتِ قرآن، ذکر باللسان) صبر و توکل کے اوصاف کو تازہ دم اور بیدار رکھنے کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ شعوری طور سے بندے کو اس کے رب سے جوڑے رکھتا ہے، اس کے حفاظتی قلعے میں محصور رکھتا اور دشمن لعین شیطان کی دست برد سے بچانے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ ہر قسم کے دشوار گذار اور مایوس کن حالات میں صبر و توکل اس کو امید و عزم بخشتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ دعوت میں نرم انداز اختیار کرنا، یہ بھی داعیِ حق، بالخصوص اللہ کے رسول کی امتیازی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ جاہل، متکبر، سرکش اور تند خو کے مقابلے میں نرم اور حکیمانہ انداز اختیار کرتا ہے۔ قولِ احسن، شیریں کلام، نرم گفتاری، ناصحانہ انداز اور مختصر مگر مدلل طرزِ بیان پتھر دل کو بھی موم کر سکتا ہے۔ اور جو دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو تو ان پر بہر حال اتمامِ حجت تو ہو ہی جاتا ہے، اور داعی کی ذمہ داری بھی اسی حد تک ہوا کرتی ہے۔

مصر میں داخلہ ۔ فرعون کو دعوت

اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کی یقین دہانی اور کامیابی و غلبے کے مژدۂ جانفزا کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کو مصر روانہ کیا جاتا ہے۔ وہ اپنے اہل و عیال کے ہمراہ مصر میں داخل ہوتے ہیں۔ گھر والوں سے ملاقات کے بعد، بھائی ہارون علیہ السلام کے ساتھ فرعون کے دربار میں پہنچتے ہیں۔ وہاں جانے سے قبل دونوں نے عرض کیا کہ ہمیں ڈر ہے کہ فرعون ہم پر زیادتی کرے یا سرکشی کی روش اختیار کرے (طٰہٰ: ۴۵)۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دلاسہ دیا کہ تم کوئی اندیشہ نہ کرو، میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں، تم دونوں وہاں جا کر اس کو دعوتِ حق دو۔ (طٰہٰ: ۴۶) چنانچہ موسیٰ علیہ السلام ہارون علیہ السلام کے ہمراہ فرعون کے دربار میں پہنچ کر اللہ کے حکم کے مطابق فرعون و آلِ فرعون کو الٰہِ واحد کی بندگی کی دعوت دیتے ہیں اور زور دیتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو آزاد کر کے ان کے ساتھ کر دیا جائے۔ قرآن میں اس واقعے کا کئی جگہ ذکر کیا گیا ہے جس کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے پاس جا کر اس کو اللہ کا پیغام سنایا اور کہا کہ: اے فرعون! میں تمہارے پاس اللہ رب العالمین کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں اور میرے لئے یہی سزاوار ہے کہ اللہ کے نام پر حق کے سوا کچھ نہ کہوں۔ میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے کھلی نشانیاں لے کر آیا ہوں۔ پس تم اب بنی اسرائیل کو تنگ نہ کرو اور ان کو میرے ساتھ جانے دو۔ اور سلامتی ہے اس کے لئے جو ہدایت کی پیروی کرے۔ اور ہم پر یہ وحی کی گئی ہے کہ اس پر عذاب ہو گا جو جھٹلائے اور روگردانی کرے۔ لیکن انہوں نے تکبر کیا اور وہ تھے ہی مجرم لوگ۔ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اگر تم کوئی نشانی لے کر آئے ہو تو اس کو پیش کرو، اگر تم سچے ہو۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا زمین پر ڈال دیا تو وہ یکایک اژدھا بن گیا۔ اور انہوں نے اپنا ہاتھ نکالا تو وہ یکایک دیکھنے والوں کے سامنے چمک رہا تھا۔ قومِ فرعون کے سردار یہ دیکھ کر کہنے لگے کہ یقیناً یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے اور چاہتا ہے کہ تمہیں تمہاری زمین سے بے دخل کر دے، تو بتاؤ اس بارے میں تمہارا کیا مشورہ ہے۔ ان کا فیصلہ یہی ہوا کہ اس کو اور اس کے بھائی کو انتظار کرنے کو کہا جائے اور اپنے آدمی بھیج کر تمام شہر سے بہترین جادوگروں کو اس کے مقابلے کے لئے اکٹھا کر لیا جائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان کو سمجھایا کہ (ہوش کرو!) تم حق کو جادو کہہ رہے ہو جبکہ وہ (پورے دلائل کے ساتھ) تمہارے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ سوچو تو سہی کیا یہ جادو ہے، جادوگر تو (انجام کار) کبھی فلاح یاب ہو ہی نہیں سکتے۔ اس پر ان لوگوں نے جواب دیا کہ تم ہمارے آبائی دین سے برگشتہ کرنا چاہتے ہو تاکہ یہاں تمہاری بڑائی قائم ہو سکے۔ (ملاحظہ ہو سورۃ الاعراف۔ آیات ۱۰۳ تا ۱۱۲/ سورۃ یونس۔ آیات ۷۵ تا ۷۸)

درج بالا سطور سے واضح ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے دربار میں اللہ رب العالمین کی وحدانیت کا مدلل پیغام پیش کیا، اس کو اللہ کے عذاب سے ڈرایا اور نبوت کی دلیل کے طور پر معجزے دکھائے۔ فرعون لاجواب ہوا لیکن موقعے کی نزاکت کے تحت اس نے غیظ و غضب کا اظہار کرنے کے بجائے ہوشیاری اور چالاکی کے ساتھ گفتگو کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔ لوگوں کو فریب دینے کے لئے دعوتِ حق کو آبائی دین سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی اور معجزوں کو جادو بتا کر لوگوں کی توجہ دوسری طرف پھیر دی اور درباریوں نے بھی ہاں میں ہاں ملا کر اس کا ساتھ دیا۔ قرآن نے فرعون کی اس قسم کی شاطرانہ چال کا ایک اور نمونہ سورۃ الشعراء میں پیش کیا ہے۔ وہاں دعوتِ حق کے جواب میں وہ آپ کی شانِ نبوت کا استخفاف اور تضحیک و تمسخر کا انداز اپناتے ہوئے کہتا ہے کہ اے موسیٰ! کیا ہم نے بچپن میں تیری پرورش نہیں کی، اور کیا تو ایک عرصے تک ہماری سرپرستی میں نہیں رہا، اور اس دوران تو نے جو کچھ کیا وہ تیرا کفرانِ نعمت کا رویہ تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کے متکبرانہ جواب میں جزئیات میں جانے اور دفاعی انداز اختیار کرنے کے بجائے نہایت حکیمانہ انداز میں حقائق کو پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے اس وقت جو کچھ کیا وہ ہوا انستگی میں کیا تھا اور اسی لئے تمہارے خوف کی وجہ سے میں نے فرار کی راہ اختیار کی۔ پھر میرے رب نے مجھے حکم عطا فرمایا اور رسولوں میں شامل کر لیا۔ اور تیرا مجھ پر یہی احسان ہے جس کو تو جتا رہا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا لیا تھا (الشعراء: ۱۷ تا ۲۲)۔

موسیٰ علیہ السلام کے اس مدلل اور مسکت جواب نے فرعون کو لاجواب کر دیا اور وہ فوراً ہی گفتگو کا رخ بدلنے پر مجبور ہو گیا۔ چنانچہ لوگوں کی توجہ دوسری طرف پھیرنے کے لئے رب کے مسئلے پر بحث شروع کر دی اور کہنے لگا کہ اے موسیٰ! تم دونوں کا رب، رب العالمین کون ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ وہ آسمانوں اور زمین کا رب اور ان سب کا جو ان کے درمیان ہے، وہ جس نے ہر چیز کو اس کی صورت عطا کی اور پھر رہنمائی فرمائی۔ پھر فرعون نے (لاجواب ہو کر) کہا کہ اگلے لوگوں کا کیا معاملہ ہو گا (جو اس دین پر تھے جس پر ہم ہیں)۔ اس طرح اس نے چالاکی سے موسیٰ علیہ السلام کو آزمایا کہ اسلاف کی بدینی پر فیصلہ سنا کر لوگوں کے تعصب اور غیظ و غضب کا نشانہ بنیں۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام نے مختصر مگر انتہائی جامع اور حکیمانہ جواب دیا کہ ان کا علم تو میرے رب کے پاس مکتوب و محفوظ ہے اور میرا رب نہ چوکتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔ اس کی ذات بھول چوک سے پاک اور منزہ ہے۔ اس طرح موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی چال کو ناکام بنا دیا۔ اس موقعے کی مناسبت سے یہ بہترین انداز تھا۔ اس کے بعد مزید آفاق و انفس کی نشانیوں کو اللہ کی قدرت کے مظاہر کے طور پر پیش کیا (ملاحظہ ہو سورۃ طٰہٰ: ۴۹ تا ۵۵/ الشعراء: ۲۳ تا ۲۸)۔ یہ دلائل اس کو لاجواب کرنے کے لئے بہت کافی تھے۔ اس نے بہت پیچ و تاب کھائے لیکن کچھ بن نہ پڑا تو اوچھے ہتھیاروں پر اتر آیا۔ اپنے وزیر ہامان کو مخاطب کر کے کہا کہ میرے لئے ایک بلند عمارت تیار کرو تاکہ میں موسیٰؑ کے الٰہ تک پہنچ سکوں اور میں تو اس کو جھوٹا سمجھتا ہوں (القصص: ۳۸)۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ دعوتِ حق کے لئے جس تحمل، نرمی اور مخاطبین کے ماحول اور صورتِ حال کے تحت حکمتِ دعوت کی ضرورت ہے وہ بدرجہ اتم موسیٰ علیہ السلام کے اندازِ تکلم میں موجود ہے۔ فرعون ہر بات پر لاجواب ہو کر گفتگو کا رخ بدلتا

رہا، تمسخر اور استہزا کے ذریعے چالاکی سے دلیل و برہان کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن موسیٰ علیہ السلام نے اس کی کج بحثی پر برافروختگی یا جھنجلاہٹ کے بجائے نرمی اور شیریں کلامی کے انداز میں سلسلہ کلام کو جاری رکھا اور آپ اللہ کی وحدانیت اور الٰہ برحق ہونے کے دلائل موثر اور دلنشیں انداز میں پیش کرتے رہے اور یہ کہہ کر اس کے ضمیر کو جھنجوڑا کہ "اس میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔" آخرکار وہ مایوس اور دلبرداشتہ ہو کر خود ہی جھنجلاہٹ پر اتر آیا اور کہنے لگا کہ (اے لوگو!) یہ رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے، دیوانہ ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس جہالت پر کوئی ردعمل ظاہر کئے بغیر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ وہ مشرق و مغرب کا رب ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے (ان کا بھی)، اگر تم عقل رکھتے ہو۔ ذرا غور کیجئے کہ جس سرزمین پر فرعون کا جاہ و جلال ربوبیت کی حد تک ہو وہاں اس کی ذات پر ایسے حملے کیسے برداشت ہو سکتے تھے۔ چنانچہ یہ سب فرعون کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ فوراً ہی جھنجلا کر کہا کہ اگر تم نے میرے سوا کسی کو معبود بنایا تو میں تمہیں قید میں ڈال دوں گا (الشعراء ۲۹تا۲۴)۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے اپنی آخری دلیل معجزات کی شکل میں پیش کی جس کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا لیکن ہٹ دھرمی کے ساتھ اس نے ضمیر کی آواز کو دبایا اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مظاہرے کو محض جادو قرار دے کر لوگوں کو فریب دیا اور اپنے باطل موقف کے دفاع پر اڑا رہا۔ اس کی کچھ تفصیل گزشتہ سطور میں آچکی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام اور ساحر

الغرض، معجزے کو سحر قرار دے کر موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے کے لئے ملک کے بڑے بڑے ماہر فن ساحروں کو جمع کیا گیا۔ اس واقعے کو تفصیل کے ساتھ قرآن میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ یہاں اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ مقابلے کے لئے بڑے قومی تہوار کا دن (یوم الزینہ) مقرر ہوا اور ایک بڑے میدان میں سب کو جمع کیا گیا۔ اس زمانے میں مصر اور آس پاس کے علاقوں میں سحر و کہانت کا بڑا چرچا تھا اور ساحروں کا اس کو معاشرے میں بڑا مقام ملا ہوا تھا۔ چنانچہ جادوگروں نے مقابلے سے پہلے فرعون سے انعام کا وعدہ لیا تو اس نے غالب ہونے پر ان کو انعام کے علاوہ مقربین بارگاہ بنانے کا بھی وعدہ کیا۔ جب جادوگر لاٹھیاں اور رسیاں لے کر مقابلے کے لئے آئے تو موسیٰ علیہ السلام نے ان کو اللہ سے ڈراتے ہوئے فرمایا کہ تم سحر کے ذریعے حق کا مقابلہ کرنے آئے ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کو باطل کر دے گا۔ اللہ سے ڈرو اور معجزے کو سحر قرار دے کر اللہ تعالیٰ پر جھوٹا الزام نہ لگاؤ ورنہ وہ تمہیں عذاب سے تہس نہس کر ڈالے گا اور جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا وہ برباد ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام کی دعوت و تبلیغ سے ان پر کچھ اثر ہوا، ان کا اعتماد مجروح ہوا اور وہ بے یقینی کا شکار ہو کر باہم صلاح و مشورے کرنے لگے۔ کہنے لگے کہ یہ دونوں تو محض جادوگر ہیں جو اپنے جادو کے زور سے تمہیں تمہارے ملک سے نکالنا اور تمہارے مثالی تہذیب و تمدن کو ختم کرنا چاہتے ہیں، لہٰذا تم اپنے حربے اکٹھے کرو اور صف بندی کر کے مقابلے پر آجاؤ اور فلاح وہی پائے گا جو آج غالب رہے گا۔ چنانچہ انہوں نے آگے بڑھ کر موسیٰ علیہ السلام کو مقابلے کی دعوت دیتے ہوئے کہا کہ پہلے آپ پھینکیں گے یا ہم کریں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ تم لوگ ہی پہل کرو۔ ساحروں نے لاٹھیاں اور رسیاں پھینکیں، لوگوں کی آنکھوں اور خیالات پر سحر کا اثر ہوا اور یہ ان کو چلتی ہوئی نظر آئیں اور لوگ ڈر گئے۔ موسیٰ علیہ السلام پر بھی اس کا اثر ہوا اور انہوں نے بھی دل میں خوف محسوس کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہدایت فرمائی کہ آپ اپنا عصا پھینکیں، یہ اس اثر کو زائل کر دے گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے عصا پھینکا اور سحر کا اثر بالکل زائل ہو گیا یعنی لاٹھیاں اور رسیاں جیسی تھیں ویسی ہی لوگوں کو نظر آنے لگیں۔ حق، حق ثابت ہو گیا اور باطل، باطل۔ فرعون اور آل فرعون کو ہزیمت ہوئی اور وہ ذلیل ہوئے۔

(ملاحظہ ہو الاعراف: ۱۱۳تا۱۱۹/ یونس: ۷۷تا۸۲/ طٰہٰ: ۶۱تا۶۹/ الشعراء: ۳۱تا۳۵)

یہاں یہ بات واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ اکثر منکرین حدیث، صحیح احادیث کے انکار کی راہ ہموار کرنے کے لئے قرآن میں بیان کردہ سحر کے اس عمل کو شعبدہ بازی یا ہاتھ کی صفائی قرار دیتے ہیں۔ یہ موقف محض جہالت و حماقت ہے۔ قرآن نے تو اس کو "سحر عظیم" کہا ہے (الاعراف ۱۱۶)۔ ایسا سحر جس کے ابطال کیلئے معجزے کو استعمال کرنا پڑا اور موسیٰ علیہ السلام شعبدے اور سحر کے فرق کو ساری دنیا سے زیادہ سمجھتے تھے۔ اگر یہ شعبدہ ہی ہوتا تو معجزے کی ضرورت تو نہ تھی۔ موسیٰ علیہ السلام معجزے کے بغیر ہی رسیاں اور لاٹھیاں اٹھا کر دکھا دیتے اور شعبدہ گری کا پردہ چاک کر دیتے (اس موضوع پر مزید تفصیل اور مختلف اشکالات کی وضاحت کیلئے ملاحظہ کیجئے "حبل اللہ" نمبر ۲۲ اور "اتقوا اللہ" نمبر ۳، ۴، ۵)۔

فرعون اور آل فرعون کی دنیا پرستی اور یوم حساب سے غفلت شعاری قبول حق میں آڑے آئی۔ اس کے برعکس ساحر جو اپنے فن کے ماہر تھے اور سحر کی حقیقت کو سمجھتے تھے، اور پہلے ہی موسیٰ علیہ السلام کی تقریر سے متاثر تھے، عصائے موسیٰ کا کرشمہ دیکھ کر سمجھ گئے کہ یہ سحر نہیں، سحر سے بالاتر اللہ کا معجزہ ہے۔ اور عوامی اعتراف حق کے جس جذبے کو جانتے ہوجھتے دبائے اور چھپائے ہوئے تھے اسی اعتراف حق کے جذبے نے ساحروں کو سجدے میں گرا دیا اور انہوں نے بے خوف و خطر اعلان کر دیا کہ ہم موسیٰ اور ہارون کے رب، رب العالمین پر ایمان لے آئے۔ فرعون اور اس کے ارکان و اعیان مملکت کی یہ چال بھی ناکام ہو گئی اور بھرے مجمع میں ان کو زبردست رسوائی اور ذلت سے دوچار ہونا پڑا۔ بہرحال اس متکبر اور ہٹ دھرم نے پھر پینترا بدلا اور لوگوں کو مرعوب کرنے کیلئے سخت رویہ اختیار کرتے ہوئے ساحروں پر برس پڑا کہ تم ذرا بھی صبر نہ کر سکے، میری اجازت کے بغیر ایمان لے آئے۔ اے! تم سب کا استاد معلوم ہوتا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے، اور یہ تمہاری خفیہ سازش ہے کہ سحر کے ذریعے ہمیں اس زمین سے بے دخل کر دو۔ میں تمہیں اس (غداری) کی عبرت انگیز سزا دوں گا، ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پیر کاٹ کر کھجور کے تنوں پر سولی پر چڑھواؤں گا۔

غور کرنے کا مقام ہے: دو قسم کے فکر و عمل رکھنے والوں میں کیسا تضاد ہے! دلیل حق کے مقابلے میں فرعونیوں نے شکست کھائی اور جادوگروں نے بھی، لیکن فرعون اور اس کے اعیان مملکت نے اس کو اپنی انانیت اور عزت نفس کا مسئلہ بنالیا۔ ایک متکبر کی یہی نفسیات ہوتی ہے جیسا کہ قرآن نشاندہی کرتا ہے

وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ (البقرۃ: ۲۰۶)

"اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو تو عزت (وقار کا احساس) اسے گناہ پر جما دیتا ہے تو پھر اس کیلئے جہنم ہی کافی ہے۔"

چنانچہ شیطان نے اس گمراہی کو ان کے لئے مزین کر دیا، قبول حق کے لئے آگے بڑھنے سے روک دیئے گئے اور آخرت کا دائمی عذاب ان کا مقدر ہو گیا۔ اس کے برعکس ساحروں

نے حق واضح ہوجانے پر اعتراف شکست کے ساتھ ہی عاجزی و انکساری کے ساتھ ضمیر کی قبول حق کی آواز پر لبیک کہا اور برملا ایمان لانے کا اعلان کردینے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہ کی۔ یہ دوٹوک قوت فیصلہ اور جرأت ایمانی خوش نصیبوں ہی کا حصہ ہوا کرتی ہے۔

فرعون نے اپنی چال کا آخری حربہ استعمال کرتے ہوئے یہ سوچا ہوگا کہ وہ اس کی جارحانہ دھمکی سے خوفزدہ ہوکر فیصلہ بدلنے پر مجبور ہوجائیں گے۔ لیکن اس نادان کو اس حقیقت کا کیا پتہ تھا کہ ایمان قلب و ذہن میں اتر جانے کے بعد دنیا اور اس کے مفادات ہیچ ہوجاتے ہیں، اور جس کی نگاہ آخرت کی کامیابی و کامرانی پر ٹھہر جائے تو اس کا اصل مسئلہ گناہوں کی مغفرت اور اللہ کی رضا کا حصول بن جاتا ہے اور پھر اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینا آسان ہوجاتا ہے۔ چنانچہ فرعون کی اس لرزہ خیز دھمکی کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا اور انھوں نے پورے اعتماد اور سکون قلب کے ساتھ اس کو صاف جواب دے دیا کہ کچھ پرواہ نہیں، ہم اپنے رب کے ہی پاس پہنچ جائیں گے اور ہمیں امید ہے کہ ہمارا رب ہماری پچھلی خطائیں معاف کردے گا، کیونکہ سب سے پہلے ہم ایمان لائے ہیں۔ اب واضح دلائل کے ساتھ ایمان کی نعمت پالینے کے بعد یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ہم تیری بات یا تیری شخصیت کو اس پر ترجیح دیں۔ تجھے جو کچھ کرنا ہے کرلے، تیرا معاملہ تو اس دنیا کی زندگی ہی تک موقوف ہے (اور ہم تو آخرت کی دائمی کامیابی کے آرزومند ہیں)۔ تو ہم کو صرف اس بات کی سزا دینا چاہتا ہے کہ ہم اپنے رب کی نشانیوں پر ایمان لے آئے جبکہ وہ ہمارے پاس آگئیں۔ پھر انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے ہمارے رب! ہم پر صبر کا فیضان کردے اور ہمیں اسلام پر وفات دے۔ (ملاحظہ ہو سورۃ الاعراف ۱۲۰-۱۲۶، طٰہٰ ۷۰-۷۳، الشعراء ۵۰-۵۱)

اب شاید کسی کو اس بات پر حیرت ہو کہ فرعون جن ساحروں کو پورے اعتماد کے ساتھ مقابلے کے لئے لایا اور جن سے انعام واکرام کے ساتھ مقربین بارگاہ بنانے کا وعدہ کیا، اب اس نے یکایک ایسی روش بدلی کہ انہی کو سازشی اور غدار قرار دے کر سولی پر چڑھانے کے لئے آمادہ ہوگیا، اور اصل ایک متکبر مفاد پرست کی یہی نفسیات ہوتی ہے، صورتحال کے بدلنے سے اس کو تیور بدلتے ذرا دیر نہیں لگتی۔ دوسری طرف ان مومنوں کا مجاہدانہ طرز عمل بھی انتہائی سبق آموز ہے۔ وہی ساحر جو جاہلیت کے عالم میں انعام واکرام کے وعدے لے کر عزت فرعون کی قسم کھا کر مقابلے کے میدان میں اترے تھے، لیکن اب ایمان کی روشنی نے جب کفر و شرک اور گمراہی کی ظلمت کا پردہ چاک کردیا اور ان کی نگاہ آخرت کی کامیابی پر جا ٹھہری تو پھر ایمان اور صبر کی طاقت کے ساتھ ان کو وہ ہمت و جرأت ملی کہ فرعون جیسے جابر و ظالم کے جبروت اور کبریائی کو ٹھوکر ماردی اور اس سے آنکھ ملا کر بات کی۔ اس کی وحشت ناک دھمکی نے ان کے ایمان و استقامت میں ذرا بھی تزلزل پیدا نہ کیا۔ چند لمحوں کے ایمان نے ان کی سیرت و کردار میں کیسا انقلاب برپا کردیا!

اس طرح فرعون کی چال الٹی پڑ گئی، معرکہ حق و باطل کے اس مرحلے میں فرعون اور اس کے ارکان سلطنت کو سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور وہ اس ہزیمت پر تلملا اٹھے۔ فرعون نے اپنے غیظ و غضب کا اظہار ان مومنوں پر تو کیا لیکن موسیٰ علیہ السلام سے وہ کسی حد تک مرعوب ہوگیا تھا، چنانچہ جب اس کی قوم کے سرداروں نے موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے خلاف سخت اقدام کا مطالبہ کیا تو وہ بات کو ٹال گیا اور صرف یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ ہم ان کے بیٹوں کو قتل کریں گے اور عورتوں کو زندہ رکھیں گے، اس طرح ہم ان پر حاوی رہیں گے۔ کبھی اس نے لوگوں کی توجہ دعوت سے ہٹانے اور اس کا اثر کم کرنے کے لئے تمسخرانہ انداز اختیار کیا کہ "اے سردارو! میں تو اپنے سوا تمہارے لئے کسی الٰہ کو نہیں جانتا۔ اے ہامان! میرے لئے ایک اونچی عمارت بنواؤ تاکہ میں موسیٰ کے الٰہ کو دیکھ سکوں، میں تو اس کو جھوٹا سمجھتا ہوں۔" (سورۃ الاعراف ۱۲۷، القصص ۳۸)

بہرحال، فرعون کے دربار میں دعوت و مکالمت کا سلسلہ جاری رہا اور بنی اسرائیل کے کچھ نوجوان بھی موسیٰ علیہ السلام کی دعوت پر ایمان لے آئے۔ اس دوران ایمان لانے والوں، بالخصوص بنی اسرائیل کی تربیت کا حکم بھی دیا گیا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ایمان کی دعوت جب بھی اٹھتی ہے، معاشرے میں اجنبی ہی ہوتی ہے۔ اس انقلابی دعوت کو قبول کرکے اس کا ساتھ دینا معاشرے کی مخالفتوں اور آزمائشوں کا پیش خیمہ ہوتا ہے، چنانچہ ذہنی تحفظات کے حاملین اور مصلحت پسندوں کے لئے (اس کو حق مانتے ہوئے بھی) اس کا ساتھ دینا مشکل ہوتا ہے۔ صرف جواں ہمت اور باحوصلہ افراد ہی اس کے لئے آگے بڑھا کرتے ہیں، اور ان میں اکثریت جواں سال افراد کی ہوتی ہے، البتہ کچھ جواں ہمت بوڑھے بھی آگے بڑھ جایا کرتے ہیں۔ لیکن اکثر بوڑھے ذہنی تحفظات اور مصلحت پسندی کا شکار ہوتے ہیں، دعوت کو حق مان کر آگے بڑھ کر ساتھ دینے سے گریزاں رہتے ہیں اور بسا اوقات جوانوں کی راہ میں بھی رکاوٹ بنتے ہیں۔ سورۃ الکہف میں نوجوان داعیان حق کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ کے آخری رسول ﷺ کے زمانے میں یہی صورتحال تھی۔ مکہ میں ایمان لانے والوں میں ایک یا دو صحابیؓ سن رسیدہ (نبی ﷺ سے زیادہ عمر والے) تھے ورنہ اکثر و بیشتر بیس سال کے قریب یا بیس اور تیس کے درمیان کی عمر والے تھے، چند ایک تیس اور چالیس کے درمیان کی عمر کے تھے۔ اسی مطابقت کی وجہ سے قرآن میں اس کو نمایاں طور سے بیان کیا گیا ہے کہ قوم موسیٰ میں چند لڑکوں (نوجوانوں) کے علاوہ اس دعوت کو کسی نے قبول نہ کیا، ان پر فرعون کے جبر و استبداد کی ہیبت بھی طاری تھی، اور خود اپنی قوم کے بزرگوں کا حوصلہ شکن رویہ ان کے لئے رکاوٹ بن رہا تھا (یونس ۸۳)۔

بنی اسرائیل کی تربیت

بہرحال، موسیٰ علیہ السلام کی ذمہ داری میں جہاں یہ چیز شامل تھی کہ وہ مظلوم اور زیردست قوم بنی اسرائیل جن کو جابر و ظالم فرعون نے غلام بناکر جور و ستم کا نشانہ بنایا ہوا تھا، آزاد کرائیں، وہاں یہ بھی ان کی ذمہ داری میں شامل تھا کہ ایمان لانے والوں کی تربیت کریں، اور ایک مسلم قوم کی حیثیت سے ان کی نشوونما اور تربیت و اصلاح کا اہتمام کریں۔ مصر میں کئی صدیاں غلامی کی حالت میں گذارنے کے بعد بنی اسرائیل من حیث القوم زوال و انحطاط کی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ معاشی و معاشرتی پستی و بدحالی کے علاوہ ایمان و عقیدہ تلپٹ ہوچکا تھا، آخرت سے بے خوفی نے اخلاقی حالت تباہ کردی تھی، خود غرضی، لالچ، بغض و حسد اور مفاد پرستی کی بیماریاں ان کا طرۂ امتیاز بن چکی تھیں۔ ذہنی جمود اور مایوسی کا بری طرح شکار تھے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ کے منصوبے کے تحت ان کی تربیت و اصلاح کا کام ہوا جو انتہائی صبر آزما اور دشوار گذار تھا،

لیکن اللہ تعالیٰ کے اولوالعزم پیغمبر نے اللہ پر توکل کرتے ہوئے نہایت ہی خندہ پیشانی سے وحی الٰہی کی رہنمائی میں اس ذمہ داری کو پورا کیا۔

موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے لئے نجات دہندہ کے طور پر مبعوث ہوئے تھے اور بنی اسرائیل نے ان سے بڑی توقعات وابستہ کرلی تھیں۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ فرعونیوں کے جور و ستم میں کوئی کمی نہیں ہو رہی تو وہ جلد ہی گلے شکوے کی روش پر اتر آئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ سے مدد چاہو اور صبر کرتے رہو بلاشبہ زمین اللہ ہی کی ہے، وہ اپنے بندوں میں جس کو چاہتا ہے وارث بنادیتا ہے، انجام کار (کامیابی) متقیوں ہی کے لئے ہے۔ وہ کہنے لگے کہ آپ کے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے گئے اور آپ کے آنے کے بعد بھی ستائے جارہے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کردے اور ان کے بجائے تمہیں اس زمین کا خلیفہ بنادے اور پھر دیکھے کہ تم کیسا عمل کرتے ہو۔ اے میری قوم کے لوگو! اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو اگر واقعی تم مسلم ہو۔ (ان میں سے چند) مومنوں نے جواب دیا کہ ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا، اے ہمارے رب! ہمیں ظالم لوگوں کے لئے فتنہ نہ بنا، اور اپنی رحمت سے ہمیں کافر لوگوں سے نجات دے (الاعراف ۱۲۸،۱۲۹؛ یونس ۸۳تا۸۶)۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ایک عام ذہن معاملات کو سیاسی، معاشی یا دیگر اسباب کی روشنی میں دیکھتا ہے جبکہ اللہ کا رسول اسباب کو استعمال تو کرتا ہے لیکن نتائج کے لئے اللہ ہی پر بھروسہ رکھتا ہے اور اسی کی اپنی قوم کو تلقین کرتا ہے، کیونکہ اسباب و علل کی خالق، مدد تو وہ ایک ہی ہستی ہے، نفع نقصان، عزت و ذلت سب اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ وہ جس کو چاہے اقتدار عطا کرے اور جس سے چاہے چھین لے۔ لہٰذا مومنین صادقین اسی پر توکل رکھتے ہیں اور ظاہر احالات سے اتنے پریشان نہیں ہوتے۔ اس آیت میں دوسری اہم بات یہ واضح کی گئی کہ یہاں جو کچھ بھی ملتا ہے، خواہ مال و دولت ہو یا عزت و اقتدار، یہ محض آزمائش و امتحان کے لئے ہے جبکہ آخرت میں یہ سب اللہ کے صالح بندوں کو بطور انعام دیا جائے گا۔ اس اصول کے تحت اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھنے والے اللہ کی نعمتوں پر شکر کرتے ہیں لیکن فخر و ریا اور تکبر میں مبتلا نہیں ہوتے اور تنگدستی، افلاس اور مصائب میں صبر و شکر کی روش پر قائم رہتے ہیں، گلے شکوے نہیں کرتے اور مصائب دور کرنے کے لئے محض اسباب پر ہی تکیہ نہیں کرتے بلکہ اللہ سے رجوع کئے رہتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام کی دعوت پر جو لوگ ایمان لائے، ان کو ایک اجتماعیت میں منسلک کرنے اور نظم و ضبط کی تربیت دینے اور اجتماعی فکر و ذہن تیار کرنے کے لئے عبادتی نظام اور تربیت کے مراکز کی ضرورت تھی، چنانچہ موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو وحی کے ذریعے ہدایت دی گئی:

واوحینا الی موسی و اخیہ ان تبوا لقومکما بمصر بیوتا
واجعلوا ... المؤمنین ❁ (یونس ۸۷)

"اور ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی کو وحی کی کہ اپنی قوم کے لئے مصر میں کچھ گھر مقرر کرو، اور اپنے گھروں کو قبلہ بناؤ اور صلوٰۃ قائم کرو اور اہل ایمان کو خوشخبری سنادو۔"

دراصل یہ حکم اس ذہنی انتشار میں مبتلا قوم کے بکھرے ہوئے شیرازے کو مجتمع کرنے کا بہت ہی مؤثر طریقہ کار تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے مسلمانوں کو یہ سمجھایا کہ موجودہ صورتحال میں صبر و شکر کے ساتھ سرزمین مصر میں رہائش پذیر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آئے۔ یہاں اپنے گھروں ہی کو مسجد بنالو اور ان کو قبلہ رخ کرکے اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کرتے رہو کیونکہ اس طاغوتی شخصیت کی چار دیواری حکومت میں اعلانیہ دعوت الی اللہ اور درس و تدریس اور صلوٰۃ کی ادائیگی ممکن نہ تھی کہ مسلمانوں کو تسلی دی گئی کہ اگر صبر و استقامت کے ساتھ کچھ وقت گذار لو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری کامیابی کا راستہ کھولے گا اور دشمن ہلاک و برباد ہوگا۔ اس زمین کا مالک فرعون اور اس کی قوم نہیں بلکہ اللہ رب العالمین ہے، وہ جس کو چاہے اس کا وارث بنادے۔ معرکہ قرآنی اور حق و باطل کی کشمکش جب انتہا کو پہنچ گئی اور اتمام حجت کا مرحلہ گذر گیا تو موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کی قوم کے لئے بد دعا کی کہ اے ہمارے رب! تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو اس دنیا کی زندگی میں زیب و زینت اور مال و دولت سے نواز رکھا ہے، کیا اس لئے کہ وہ لوگوں کو تیرے راستے سے بھٹکائیں؟ اے ہمارے رب! ان کے مال غارت کردے اور ان کے دلوں پر ایسی مہر لگادے کہ وہ ایمان نہ لائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ تم دونوں کی دعا قبول کرلی گئی۔ اب تم دونوں ثابت قدم رہو اور ان لوگوں کی ہرگز پیروی نہ کرو جو (حقیقت کا) علم نہیں رکھتے (یونس ۸۸، ۸۹)۔

مال و دولت کی فراوانی اور اقتدار شدید آزمائش ہوتے ہیں۔ اللہ سے بے خوف انسان جب اس کو اپنی قوت و صلاحیت کا ہی نتیجہ سمجھنے لگے اور محض عیش و عشرت کو مقصد حیات سمجھ کر اس کے حصول میں لگ جائے تو یہ اس کے اندر فخر و ریا اور تکبر کی نفسیات کو جنم دیتے ہیں اور اس کی گمراہی کا سبب بنتے ہیں، اور پھر وہ ان کے ذریعے اپنی بڑائی کے لئے دوسروں کو گمراہ کرنے لگتا ہے۔ اس کے برعکس مال و اقتدار کو اللہ کی نعمت و آزمائش سمجھ کر اس کو آخرت بنانے کا ذریعہ سمجھیں تو یہ اللہ کی قربت اور اخروی فلاح کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

فرعون اور قوم فرعون کو طویل عرصے تک دعوت و تبلیغ اور اتمام حجت کے بعد یہ بد دعا کی گئی۔ دراصل باغی اور سرکشوں کیلئے آخری مرحلے میں نبی کی بد دعا خود رب ذوالجلال کے فیصلے کا ان کے لئے اعلان ہوتا ہے اور اس کے نمائندے کی زبان پر جاری کردیا جاتا ہے۔ نوح علیہ السلام کی زبانی ان کی قوم کو بھی اسی طرح بد دعا دی گئی تھی۔

اللہ تعالیٰ کے قانون مہلت کے تحت فرعون اور اس کی قوم کو مہلت دی گئی۔ موسیٰ و ہارون علیہما السلام ان کو دعوت حق دیتے رہے، لیکن حق کی طرف آنے کے بجائے وہ حق کی مخالفت میں آگے بڑھتے رہے۔ قرآن نے ان کی اسی روش کو بیان کیا ہے:

وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا ۚ (النمل ۱۴)

"انہوں نے ظلم و تکبر کے ساتھ انکار کردیا حالانکہ ان کے دل قائل ہوچکے تھے۔"

وہ بنی اسرائیل کی اولاد نرینہ کو قتل کرتے رہے اور موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے خلاف اور فرعون کی ربوبیت کیلئے زبردست پروپیگنڈہ مہم شروع کردی (الاعراف ۱۲۷)۔ پھر وحی کے ذریعے متنبہ کردینے کے بعد ان پر عذاب کے کوڑے برسنے شروع ہوئے۔ چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا کہ ہم نے آل فرعون کو کئی سال قحط اور پیداوار کی کمی میں مبتلا کیا تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں، لیکن ان کا تو یہ حال تھا کہ جب ان پر خوشحالی کا

دور آتا تو کہتے کہ ہم تو اس کے مستحق ہیں۔ اور جب برا وقت آتا تو اس کو موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی نحوست ٹھہراتے۔ حالانکہ ان کی فال بد توفی الحقیقت اللہ ہی کے پاس تھی، مگر ان کی اکثریت اس سے لاعلم تھی۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تم ہمیں مسحور کرنے کے لئے کوئی بھی نشانی لے آؤ، ہم تم پر ایمان لانے والے نہیں۔ آخر کار اللہ نے ان پر طوفان بھیجا، ٹڈی دل چھوڑے، سُرسُریاں پھیلائیں، مینڈک نکالے اور خون برسایا۔ اور یہ سب نشانیاں الگ الگ دکھائیں، پھر بھی انہوں نے تکبر کیا (ہٹ دھرمی سے سرکشی پر جمے رہے) وہ تھے ہی بڑے مجرم! (الاعراف ۱۳۰ تا ۱۳۳)

امتحان کی اس دنیا میں انسان کو آزادی و اختیار دیا گیا ہے اور الفاظ بھی دیئے گئے ہیں کہ وہ حق کو حق مان کر الفاظ میں اس کا اعلان کر دے یا حق کو باطل اور باطل کو حق ٹھہرانے کے لئے ان الفاظ کا استعمال کرے۔ بہر حال، یہ بڑا ہی سنگین معاملہ ہے کہ انسان معجزے کو سحر قرار دے جبکہ وہ نبی کی نبوت کی دلیل پر حرف آخر ہوتا ہے، پھر تو وہ اپنے آپ کو اللہ کے شدید عذاب کا مستحق ٹھہرا دیتا ہے۔ فرعون اور اس کی قوم کا یہی معاملہ تھا۔ موسیٰ ہارون علیہما السلام کی دعوت مسترد کرنے کے بعد جب انہوں نے ہٹ دھرمی کی روش اختیار کر لی تو اللہ کے عذاب کے کوڑے ان پر برسے، عجیب و غریب آفات ارضی و سماوی میں مبتلا کئے گئے، کئی سال تک قحط پڑے، طوفان آیا، ٹڈیوں کے دل آئے جنہوں نے ان کے غلے اور سبزی وغیرہ کی فصلوں کا صفایا کر دیا، سُرسُریوں (یا جوؤں) اور مینڈکوں نے ان کے گھروں کے کپڑوں اور بستروں کا ستیاناس کر کے رکھ دیا، گھروں اور راستوں میں مینڈک ہی مینڈک کودنے لگے، دریاؤں اور تالابوں کا پانی خون ہو گیا۔ یہ آفات علیحدہ علیحدہ ظاہر ہوئیں۔ ہر مرتبہ تنگ آکر موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کرتے کہ اے موسیٰ! آپ سے جو آپ کے رب نے عہد کیا ہے اس کی بناء پر ہمارے لئے دعا کرو، اگر تم ہم پر سے اس عذاب کو ٹل وا دو تو ہم ضرور تم پر ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو تمہارے ساتھ بھیج دیں گے۔ پھر جب وہ آفت کچھ مقررہ مدت تک کیلئے دور کر دی جاتی تو پھر وہ یکلخت اپنے عہد سے پھر جاتے (الاعراف ۱۳۳، ۱۳۵، الزخرف ۴۶ تا ۵۰)۔

قوم فرعون کا مردِ مومن

گزشتہ سطور میں حق و باطل کی معرکہ آرائی کا ایک جائزہ پیش کیا گیا۔ موسیٰ و ہارون علیہما السلام شدید مخالفت و مزاحمت کے باوجود صبر و استقامت کے ساتھ دعوت و تربیت کے کام کو جاری رکھے ہوئے تھے۔ فرعون نے ابتداء بنی اسرائیل کی اولاد نرینہ کے قتل کے فیصلے سے اپنے سرداروں کو کسی حد تک مطمئن ضرور کر دیا تھا لیکن ان سب کے لئے یہ بات بے حد تشویشناک اور باعث اضطراب تھی کہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کی تعداد میں رفتہ رفتہ اضافہ ہو رہا تھا، اور یہ تحریک بتدریج زور پکڑتی جا رہی تھی۔ بالآخر وہ مجبور ہو گیا کہ سرداروں کے مشورے پر نظر ثانی کرے اور موسیٰ علیہ السلام کو قتل کروا ڈالے۔ موسیٰ علیہ السلام کے پاس جب یہ خبر پہنچی تو آپ نے بغیر کسی خوف و گھبراہٹ کے جواب دیا کہ میں تو اپنے اور تمہارے رب کی پناہ میں آ گیا۔ قرآن کے الفاظ ہیں:

وقال فرعون ذروني اقتل موسى وليدع ربه ۚ اني اخاف ان يبدل دينكم او ان يظهر في الارض الفساد ۞ وقال موسى اني عذت بربي وربكم من كل متكبر لا يؤمن بيوم الحساب ۞

(المومن: ۲۶، ۲۷)

"اور فرعون نے کہا کہ مجھے چھوڑ دو، میں موسیٰ کو قتل کر ڈالوں اور وہ اپنے رب کو پکارے، مجھ کو اندیشہ ہے کہ کہیں وہ تمہارا دین نہ بدل ڈالے یا ملک میں فساد پھیلا دے۔ اور موسیٰ نے کہا میں نے اپنے اور تمہارے رب کی پناہ لی ہر اس متکبر سے جو یوم حساب پر ایمان نہیں رکھتا۔"

ایمان کی دعوت کا یہ اعجاز ہے کہ دشمنوں کی صفوں سے اپنے ہمنوا نکال لاتی ہے اور کبھی کٹر دشمن کو "ولی حمیم" بنا دیتی ہے۔ جب کہ فرعون اور اس کے سردار باہم اس گفتگو میں مصروف تھے اس قوم فرعون کا ایک "مردِ مومن" جس نے اپنے ایمان کو اب تک خفیہ رکھا ہوا تھا موسیٰ علیہ السلام کی مدافعت میں اٹھ کھڑا ہوا اور بھرے دربار میں ایمان و آخرت پر ایک دلگداز اور رقت آمیز تقریر کر ڈالی جو قرآن کی سورۃ المومن کے تقریباً ڈیڑھ رکوع میں مذکور ہے (المومن ۲۸ تا ۴۴)۔ اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

"مردِ مومن نے اپنی قوم کو سمجھایا کہ تم ایک ایسے شخص کو قتل کرنے چلے ہو جو یہی بات کہہ رہا ہے کہ میرا رب اللہ ہے، اور وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے دلائل و واضح نشانیاں لے کر آیا ہے۔ اس نے مزید سمجھایا کہ مجھے ڈر ہے کہ تم پیغام الٰہی سے روگردانی کرنے کی پاداش میں پچھلی قوموں، قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود اور ان کے بعد دوسری قوموں کی طرح ہلاکت سے دوچار نہ کر دیئے جاؤ۔ میں تمہیں بربادی اور چیخ و پکار والے دن سے ڈراتا ہوں، جب کہ تم پیٹھ پھیر کر بھاگو گے لیکن اللہ سے بچانے والا کوئی نہ پاؤ گے۔ میری بات مانو میں تمہیں صحیح راہ دکھا رہا ہوں۔ یہ دنیا کی زندگی تو محض چند روزہ ہے اور اصل جائے قرار تو آخرت کا گھر ہی ہے، جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا، اور جس کسی (مرد یا عورت) نے ایمان کے ساتھ عمل صالح کی روش اپنائی وہ جنت میں داخل ہو گا جہاں اسے بے حساب رزق ملے گا۔ اے میری قوم! میں تمہیں دائمی نجات کی طرف دعوت دے رہا ہوں، اس زبردست رب کی بندگی کی طرف جو بہت مغفرت کرنے والا ہے، اور تم مجھے آگ کے عذاب کی طرف بلا رہے ہو کہ میں بھی (تمہاری طرح) کفر و شرک کا مرتکب ہو کر ان ہستیوں کو پکاروں، ان کی بندگی کروں جن کو پکارے جانے اور ربوبیت کا نہ دنیا میں کوئی حق ہے اور نہ آخرت میں۔ ہم سب کو تو اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے اور حد سے گزرنے والے ہی جہنمی ہوں گے۔ آج تم نے میری نصیحت نہ مانی تو کل تم میری بات یاد کرو گے اور میں اپنے معاملے کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔"

اس مردِ مومن کے ایمان، آخرت کے گہرے شعور اور خلوص میں ڈوبی ہوئی یہ معرکۃ الآرا تقریر فی الحقیقت قرآن کی دعوت کا خلاصہ پیش کرتی ہے۔ اس میں دنیا کی بے ثباتی اور اس دور کے کفر و شرک (غیر اللہ کی پکار، نیم دار آلودہ دین) کا موثر انداز میں اجمالی خاکہ پیش کر دیا گیا ہے۔ اندازہ کیجئے کہ اس باثر شخص نے دلگداز خطاب نے فرعون کے دربار میں کیسا ہیجان برپا کر دیا ہو گا اور یہ شخص تمام درباریوں کی توجہ کا مرکز بن گیا ہو گا، فرعون اور اس کے ہم نواؤں کے ذہنوں میں اس صورت حال پر خطرے کا الارم بج رہا ہو گا۔ بہر حال، فرعون نے بار بار اس کے خطاب کو بے اثر کرنے اور لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لئے مداخلت کی کوشش کی لیکن وہ تقریر کے تسلسل کو توڑنے اور اس کی اثر انگیزی کو کم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ مردِ مومن درباریوں کے ضمیر کو جھنجھوڑ رہا کہ "آج میری بات نہ مانی تو کل پچھتاؤ گے"۔ اس کو خوب اندازہ ہو گا کہ

مکہ میں ابو بکر صدیق نے بھی اللہ اس وقت نے جبکہ انہوں نے عقبہ بن ابی معیط کو گردن [illegible]
نبی ﷺ کے گلے میں چادر ڈال [illegible] (صحیح بخاری کتاب [illegible])

اس فیصلہ کن و بے باکانہ اقدام کے بعد وہ فرعونی سلطنت کے عتاب کا شکار ہوگا، تاہم اپنے معاملے کو اللہ کے حوالے کر کے اس دنیا کی ہر قسم کی مشقت و آزمائش سے بے نیاز ہو جاتا ہے (سورہ المؤمن ۴۵-۲۸:۴۰)۔

بالآخر فرعون اور اس کے بے بس امراء اب ان سازشوں اور تدبیروں میں لگ گئے کہ کسی طرح موسیٰ علیہ السلام اور اس مردِ مومن کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کی حفاظت ہو تو باطل قوتیں داعیانِ حق کو نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہوا کرتیں۔ چنانچہ قرآن میں بتایا کہ پھر اللہ تعالیٰ نے اس (مردِ مومن) کو ان کی بری چالوں سے بچا لیا اور آلِ فرعون کو بدترین عذاب نے گھیر لیا (المؤمن ۴۵:۴۰)۔

موسیٰ علیہ السلام اور قارون

قارون بنی اسرائیل ہی میں سے تھا لیکن دنیاوی مفادات اور مال و دولت کی ہوس نے اسے اپنی قوم سے بے وفائی پر مائل کیا اور وہ ان سے کٹ کر قومِ فرعون میں جا ملا۔ گیا اور فرعون کے ارکانِ سلطنت کا گویا چوتھا ستون بن گیا۔ اس کی چاپلوسی اور بیان میں مال دینے اور فرعون کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے حق کو باطل اور باطل کو حق قرار دینے کیلئے آمادہ نظر آتا۔ اپنی قوم کے ساتھ ظلم و زیادتی کرتا اور ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتا۔ چنانچہ وہ اس وقت کے طاغوت کا ایسا ستون بن گیا تھا کہ قرآن نے نمایاں طور پر فرعون کے ساتھ اس کے وزیر ہامان اور اس اسرائیلی سیٹھ کا ذکر کیا ہے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کو ساحر کہنے والے جن تین افراد کا ذکر کیا ہے ان میں بھی ایک قارون ہے (سورہ العنکبوت ۳۹:۲۹، المؤمن ۲۴:۴۰)۔

اللہ تعالیٰ نے اس کو بے انتہا مال و دولت عطا کیا تھا، اور اس کے خزانے زر و جواہر سے بھرے تھے، یہاں تک کہ قوی ہیکل مزدوروں کی ایک جماعت اس کے خزانوں کی صرف کنجیاں بھی بمشکل اٹھا سکتی تھی۔ مال و دولت کی فراوانی نے اس کو بے حد مغرور بنا دیا تھا اور وہ دولت کی حرص و ہوس کے نشے میں سرشار رہتا تھا۔ فخر و ریا کے جراثیم اس کی رگ و پے میں سرایت کر گئے تھے۔ سورۃ القصص میں اس کے کردار اور انجام کو بڑے ہی سبق آموز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل کے سنجیدہ و سمجھدار لوگوں نے قارون کو اعتدال کی روش اپنانے کی نصیحت کی اور سمجھایا کہ نمود و ریا اور اترانے سے بچو، اللہ تعالیٰ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اللہ نے تمہیں جو کچھ عطا کیا ہے اس سے آخرت بنانے کی کوشش کرو اور (اعتدال کے ساتھ) دنیا سے بھی فائدہ اٹھاؤ۔ لوگوں کے ساتھ بھلائی کرو جیسا کہ اللہ نے تمہارے ساتھ بھلائی کی ہے (یعنی اللہ کا دیا ہوا مال اس کے ضرورت مند بندوں پر خرچ کرو تاکہ اللہ کی عنایات و نوازشات کی شکر گزاری کا حق ادا ہو سکے) اور زمین پر فساد نہ پھیلاؤ۔ اس متکبر، احسان فراموش اور آخرت سے بے نیاز شخص نے ان مخلصانہ پند و نصائح کے جواب میں ان کو ٹھکرا دیا اور جواب دیا کہ "یہ سب تو مجھے میری علمی صلاحیت کی بنا پر ملا ہے۔" اس کو آج بھی معلوم نہ تھا کہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ مختلف ادوار میں کتنے ہی لوگوں کو ہلاکت سے دوچار کر چکا ہے جو اس سے کہیں زیادہ قوت اور جمع پونجی (اور مال) والے تھے۔ اور (ایسے) مجرموں سے ان کے گناہ پوچھے نہیں جاتے (القصص ۷۸-۷۶:۲۸)۔

ان آیات میں قارون کا جو انداز فکر بتایا گیا ہے وہ ہر خود غرض، حریص و زر پرست کا کردار ہوتا ہے۔ اس کی ساری سعی و جہد مال و دولت سمیٹنے اور جمع کرنے کے لئے وقف ہوتی ہے، یہی اس کا مقصدِ حیات ہوتا ہے۔ اللہ کے دیئے ہوئے مال کو سمجھتا ہے کہ یہ اس نے اپنی علمی صلاحیت و مہارت سے حاصل کیا ہے لہٰذا اس میں کسی کا کوئی حق نہیں۔ اس انداز فکر کی وجہ سے وہ جذبہ شکر گزاری اور احسان مندی کی صفت سے محروم ہو جاتا ہے۔ قارون اسی کردار کا حامل تھا۔ قوم کے سمجھدار لوگ اس کو اللہ سے ڈراتے رہے اور اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی نصیحت کرتے رہے لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ وہ ضد اور ہٹ دھرمی سے لوگوں پر رعب جمانے اور اپنی شان و شوکت دکھانے کی کوشش کرتا رہا۔ چنانچہ ایک دن اپنی پوری زینت اور شان و شوکت کے ساتھ وہ اپنی قوم کے سامنے نکلا تو جو لوگ حیاتِ دنیا کے شائقین اور طلبگار تھے کہنے لگے کہ اے کاش ہمیں بھی وہی ملتا جو قارون کو دیا گیا ہے، بلاشبہ وہ بڑے ہی نصیبوں والا ہے۔ اور جن لوگوں کو اللہ نے علم و بصیرت سے نوازا تھا انہوں نے کہا کہ تمہارا برا ہو، اللہ کا ثواب (اس مال و دولت سے) بہتر ہے اس شخص کے لئے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے، اور یہ نہیں ملتا مگر صبر کرنے والوں کو۔ پھر ہم نے اس کو اور اس کے گھر (دولت کدے) کو زمین میں دھنسا دیا، پھر نہ تو کوئی جماعت اس کی مددگار ثابت ہوئی اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو اللہ کے عذاب سے بچا سکا۔ پھر کل جو لوگ اس جیسا ہونے کی تمنا کر رہے تھے (اپنے طرزِ عمل پر نادم ہوئے اور) کہنے لگے کہ افسوس، بے شک اللہ اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ اگر اللہ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہم کو بھی زمین میں دھنسا دیتا۔ افسوس، بلاشبہ انکار کرنے والے فلاح نہیں پائیں گے (القصص ۸۲-۷۹:۲۸)۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انسان کو امتحان کے لئے پیدا کیا اور اس میں کامیاب ہونے والے کے لئے ہی حقیقی کامیابی ہے۔ جو اللہ کے بندے اس کا شعور رکھتے ہوئے اس میں پورے اترتے ہیں پھر ان کا طرز عمل یہ ہوتا ہے کہ اگر انہیں کم رزق دے کر آزمایا جائے تو وہ صبر کرتے ہیں اور رزق کی زیادتی کے ساتھ آزمائے جائیں تو شکر کرتے ہیں۔ رحمن کے یہی بندے ہر آزمائش میں پورے اترتے ہیں۔ فرعون کے واقعے میں دو کردار ممیز ہو کر سامنے آئے، ایک فرعون، ہامان و قارون جیسے دنیا پرست کا، دوسرا قومِ فرعون کے مردِ مومن اور ایمان لانے والے ساحروں کا۔ قارون بنی اسرائیل کا زر پرست فرد ہے جو حرص و ہوس کا پیٹ بھرنے کے لئے اپنی مظلوم قوم کے بجائے فرعون و ہامان کا دست و بازو بن جاتا ہے۔ اسے بے حد و حساب دولت ملتی ہے تو اور زیادہ پھول جاتا ہے۔ قرآن ایسے لوگوں کے بارے میں بتاتا ہے "جو ہم سے ملاقات پر یقین نہیں رکھتے، دنیوی زندگی پر راضی ہو گئے اور اسی میں مگن ہیں" (یونس ۷:۱۰)۔ لیکن یہ دنیا بھی تعیش کتنے دن کا؟ بالآخر دائمی عذاب اور ذلت و رسوائی اس کا مقدر بنتی ہے۔ اس کے برعکس قومِ فرعون کا مردِ مومن ہے جو بظاہر فرعون کے ایوانِ مملکت میں اعلیٰ مقام رکھنے والا ہے۔ وہ ایمان کی روشنی پا کر اپنی منزل متعین کر لیتا ہے اور پھر مردانہ وار حق کا ساتھ دیتا ہے۔ باطل سے آنکھیں چار کر کے اس کو جھنجوڑتا ہے، اللہ پر توکل کر کے اپنے معاملے کو اللہ کے سپرد کر دیتا ہے۔ اخروی فلاح کے لئے برضا و رغبت دنیا قربان کر دیتا ہے۔ ان ایمان کی روشنی پانے والوں کا قرآن اس طرح ذکر کرتا ہے

ان کا رب ان کے ایمان لانے کے سبب انہیں کی منزل اور نعمت بھری جنتوں تک

پہنچاتا ہے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی...... (یونس ۹)

اللہ تعالیٰ اپنے ان ہی ہدایت یافتہ بندوں کے اوصاف سے نوازدے، اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

بنی اسرائیل کا مصر سے خروج

جب مدعو قوم میں صالح عنصر باقی نہ رہے اور باطل تو تیں داعیان حق اور ان کے ایماندار ساتھیوں کو قتل کرنے کی منصوبہ بندی کرنے لگ جائیں تو مشن اپنے آخری فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے، وقت آجاتا ہے کہ باطل پرستوں پر اللہ کا عذاب نازل ہو اور مومنوں کو نجات دی جائے۔ موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ وحی اللہ کا حکم ملتا ہے کہ

"رات کے وقت میرے بندوں کو لے کر نکل جاؤ، یقیناً تمہارا پیچھا کیا جائے گا۔"
(الشعراء ۵۲)

چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے تمام ایمانداروں کو جمع کیا اور پھر پورا قافلہ بحر احمر کی طرف روانہ ہوا۔ ادھر فرعون کو جب پتہ چلا تو اس نے اپنے ہرکارے شہروں میں دوڑادیے اور اپنے اعیان سلطنت کی معیت میں بڑا لشکر لے کر سورج نکلتے وقت موسیٰ علیہ السلام کے تعاقب میں نکلا۔ جب موسیٰ علیہ السلام کا قافلہ بحر احمر کی شمالی خلیج کے قریب پہنچ گیا تو فرعون کا لشکر بھی ان کا پیچھا کرتا ہوا وہاں آپہنچا۔ یہ دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی کہنے لگے کہ ہم تو پکڑے گئے، ایک طرف فرعون کا لشکر ہے تو دوسری طرف سمندر! موسیٰ علیہ السلام نے ان کو تسلی دی کہ ڈرو نہیں، بے شک میرا رب میرے ساتھ ہے۔ پھر اللہ کے حکم سے موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پانی پر مارا، سمندر دو حصوں میں پھٹ گیا اور ہر حصہ ایسا ہو گیا جیسے کہ بڑا پہاڑ۔ پھر دوسرے فریق یعنی فرعونی لشکر کو بھی سمندر کے قریب پہنچا دیا۔ بنی اسرائیل کو سمندر پار کرا دیا، فرعون اور اس کے لشکر نے پیچھا کیا اور سمندر کے بیچوں بیچ پہنچا تو سمندر کا پانی دوبارہ مل گیا اور تمام لشکر ڈوب گیا۔ فرعون جب غرق ہونے لگا تو کہنے لگا کہ میں اب ایمان لایا اس بات پر کہ کوئی رب نہیں سوائے اس کے جس پر بنو اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں اس کے فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو بتایا گیا کہ تو اب ایمان لایا ہے، اس سے قبل تو نافرمانی کرتا رہا تھا اور فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔ اب ہم تیرے بدن کو بچائیں گے تاکہ بعد والوں کے لئے نشان عبرت بنے۔ قرآن نے اس کی منظر کشی فرمائی ہے:

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ ...... عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿﴾
(یونس: ۹۰ تا ۹۲)

"اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار کر دیا۔ فرعون اور اس کے لشکر نے ہٹ دھرمی اور سرکشی میں ان کا پیچھا کیا یہاں تک کہ ڈوبنے لگے۔ فرعون کہنے لگا کہ میں ایمان لاتا ہوں کہ اس الٰہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں مسلمان ہوں۔ (اللہ نے فرمایا کہ) تو اب ایمان لاتا ہے جبکہ اس سے پہلے تو نافرمانی کرتا رہا اور فساد پھیلانے والوں میں تھا۔ آج ہم تیرے بدن کو بچائیں گے تاکہ تو اپنے بعد میں آنے والوں کے لئے ایک نشانی رہے اگرچہ اکثر لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں۔"

(مزید حوالے کیلئے ملاحظہ فرمایئے سورہ طٰہٰ ۷۷، ۷۸، الشعراء ۵۲ تا ۶۶، الدخان ۲۳ تا ۲۹)

یہ مقام عبرت و نصیحت ہے کہ وہ محلات، باغات، چشمے اور خزانے جو فرعون اور اس کی قوم کو آخرت سے غافل کئے ہوئے تھے، وہ خود ہی ان سب کو چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے اور آنکھوں دیکھتے، ہوئے سمندر میں داخل ہو گئے، غرق ہونے کے لئے! نہ تو آسمان ان کی ہلاکت پر رویا اور نہ زمین نے نوحہ کیا! منصوبہ بنایا تھا بنی اسرائیل کے خلاف، لیکن عملاً یہ ثابت ہوا انہی کے خلاف۔ اللہ تعالیٰ نے ایک ہی حکم کے ذریعے فرعون اور اس کی قوم کو پانی میں غرق کر دیا اور بنی اسرائیل کو نجات دیدی! رب ذوالجلال کا حکمت پر مبنی منصوبہ حق کے ساتھ وقوع پذیر ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام کی دعا تھی:

فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿﴾ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا (یونس: ۸۸)

"یہ ایمان نہ لانے پائیں یہاں تک کہ دردناک عذاب کو دیکھ لیں، اللہ تعالیٰ نے کہا بلاشبہ تم دونوں کی دعا قبول کی گئی۔"

فرعون نے اپنی آنکھوں سے عذاب کے فرشتوں کو دیکھ کر ہی ایمان کا اقرار کیا۔ مقام عبرت ہے کہ منصوبہ ربانی اس ظالم و جابر کو مع لشکر کہاں سے کہاں کھینچ لایا۔ موسیٰ علیہ السلام کے معجزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد بھی وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ بحر احمر میں خشک راستہ ایک معجزہ ہے، اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ کی غائبانہ نصرت ہے، اور یہ بنی اسرائیل کو ساحل تک پہنچانے کے لئے ہے نہ کہ قوم فرعون کو!

موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے حالات پر مشتمل تاریخ انسانی کا یہ باب کس قدر عبرت انگیز اور سبق آموز ہے۔ طویل عرصے تک غلامی اور بدحالی کا شکار رہنے والی قوم بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کس طرح انتہائی پستی سے اٹھاتا ہے اور بغیر جنگ و جدال فرعون کے پنجہ غلامی سے نجات دلا کر ایک آزاد اور باوقار قوم کی حیثیت سے زندگی گزارنے کا موقعہ عطا فرماتا ہے۔ اللہ کے نبی پر ایمان لانے اور معرکہ حق و باطل میں حق کا من حیث القوم ساتھ دینے کا یہ انعام ہے۔ دوسری طرف عظیم الشان سلطنت کا حکمراں، قوت و جبروت والا ظالم و جابر اللہ کے منصوبے و مشن کی مخالفت کرنے کے جرم میں انتہائی ذلت و رسوائی سے دوچار ہوتا ہے، پورے لاؤ لشکر کے ساتھ سمندر میں غرق ہونے کے لئے خود ہی اتر جاتا ہے۔ ایک طویل معرکہ حق و باطل کا یہ انجام و اختتام بلاشبہ رب ذوالجلال کی قدرت کاملہ کا عظیم کرشمہ ہے۔ (جاری ہے)

حدیثِ رسول ﷺ

براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ہمیں سات باتوں کا حکم دیا اور سات باتوں سے منع فرمایا۔ ہم کو مریض کی عیادت کرنے، جنازوں میں شرکت کرنے، چھینک کا جواب دینے (یعنی اگر چھینکنے والا الحمدللہ کہے تو ہم کہیں یرحمک اللہ)، دعوت قبول کرنے، قسم پورا کرنے، مظلوم کی مدد کرنے اور سلام پھیلانے کا حکم دیا، اور سونے کی انگوٹھی یا چھلا پہننے، سونے چاندی کے برتن استعمال کرنے، ریشمی کپڑوں حریر، دیباج، سندس اور میاثر پہننے سے منع فرمایا۔

(صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب حق اجابة الولیمة)

سیّد و سادات

یعقوب علی

انسان کی تخلیق کا مقصد اور غرض وغایت اللہ واحد کی عبادت ہے، یعنی خود کو اپنے آقا و مالک حقیقی، اللہ تعالیٰ کا غلام اور بندہ سمجھنا۔ اس حقیقت کا اپنی عملی زندگی سے ثبوت دینے والا انسان اللہ تعالیٰ کے اس امتحان اور آزمائش میں کامیاب ہے، جس کے لئے مالک نے اسے دنیا میں بھیج کر اختیار اور ارادے کی محدود آزادی دی ہے۔ الوہیت و ربوبیت صرف خالق کے لئے ہے۔ تمام انسان اس حیثیت میں ایک جیسے ہیں کہ ان سب کو اللہ تعالیٰ نے تخلیق فرمایا ہے اور وہ ان سب سے ایک ہی مطالبہ کرتا ہے کہ اس کو الٰہ واحد مان کر اپنی زندگی اسی کے نازل کردہ قوانین کے مطابق گزاریں۔ اب کوئی کہیں کا بھی رہنے والا ہو، کسی بھی قوم و قبیلے سے اس کا تعلق ہو، اگر وہ اللہ کے اس مطالبے کو پورا کرے تو وہی اللہ کے نزدیک امتحان میں کامیاب ہے اور دنیا و آخرت میں اللہ کے انعامات کا حقدار بھی۔ اس کے برعکس اللہ کی بندگی کے خلاف راستہ اختیار کرنے والا دنیا و آخرت میں اللہ کے انعامات کا حقدار نہیں چاہے وہ اللہ کے کسی برگزیدہ نبی کے خاندان سے ہی تعلق رکھتا ہو یا ان کا پوتا ہی کیوں نہ ہو۔ وہ شخص اس لئے معزز نہیں ہو سکتا کہ وہ نبی کی نسل سے تعلق رکھتا ہے یا نبی کا پوتا ہے۔

دنیا میں انبیاء علیہم السلام آتے رہے اور انسانیت کے سامنے بندگی رب و کفر بالطاغوت کی دعوت پیش کرتے رہے۔ جن ہوشمندوں نے اس دعوت پر غور و فکر کر کے اسے قبول کیا اور اس کے تقاضے پورے کرنے کے لئے تیار ہوئے چاہے وہ کسی بھی رنگ، نسل یا معاشرے کے کسی بھی طبقے سے تعلق رکھنے والے تھے وہی انبیاء علیہم السلام کے ساتھی بنے۔ انہی کو اللہ تعالیٰ نے اپنے عذاب سے بچایا۔ اور جنہوں نے نبی کا ساتھ دینے کے بجائے اپنی مشرک قوم کا ساتھ دیا اور ایمان نہ لائے، چاہے وہ ان انبیاء کے رشتے دار ہی کیوں نہ رہے ہوں، قوم کے ساتھ ہی اللہ کے عذاب میں گرفتار ہوئے۔ قرآن میں نوح علیہ السلام کے بیٹے (سورہ ہود ۴۲) نوح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کی بیویوں (سورہ التحریم ۱۰) اور ابراہیم علیہ السلام کے والد (سورہ توبہ ۱۱۴) کے واقعات میں یہی بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں حسب و نسب نہیں دیکھا جاتا بلکہ ایمان و عمل دیکھا جاتا ہے۔ احادیث میں بھی یہ مسئلہ بالکل واضح ہے۔ ایک شخص نے نبی ﷺ سے اپنے فوت شدہ باپ کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے جواب دیا کہ وہ جہنم میں ہے۔ یہ سن کر سائل افسردہ ہو کر لوٹنے لگا تو نبی ﷺ نے اسے بلا کر فرمایا کہ تیرا ہی باپ نہیں میرا باپ بھی جہنم میں ہے۔ (صحیح مسلم، کتاب الایمان) اس کے علاوہ ابوطالب کے جہنم میں ہونے کی آپ ﷺ نے خبر دی (صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب قصہ ابی طالب) حالانکہ یہ وہ شخص تھا جس سے متعلق اللہ کے نبی ﷺ شدید خواہش رکھتے تھے کہ وہ ایمان لے آئے۔ نبی ﷺ کے چچا ابولہب کا معاملہ بھی پیش نظر رہے اور اس کی رسول سے دشمنی کے سبب قرآن میں اس کا نام لے کر مذمت کی گئی ہے۔ یہ دونوں اللہ کے نبی ﷺ کے قریب ترین قرابت دار ہیں، مگر ایمان کے فقدان کے سبب نبی ﷺ کی قرابت داری ان کے کچھ کام نہ آئی۔

اللہ کی نگاہ میں سب انسان انسان ہونے کی حیثیت میں برابر ہیں۔ ان کے مراتب و مدارج ایمان و عمل کے لحاظ سے ہیں، کسی خاص رنگ و نسل یا قومیت کی بنا پر نہیں۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یوں بیان فرمایا ہے کہ:

يٰأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقٰكُمْ ۚ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿﴾
(الحجرات ۱۳)

"اے انسانو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور قبیلے بنا دیے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نسل پرستی کی اس گمراہی کی جڑ کاٹی ہے جو ہمیشہ دنیا میں فساد کی ایک بڑی وجہ بنی رہی ہے۔ رنگ و نسل، زبان و وطن، قومیت و علاقائیت کا تعصب اور اس کی بنا پر برتری اور بڑائی کے دعوے اسی گمراہی کی بنا پر ہوتے رہے ہیں۔ قوموں اور قبیلوں نے اسی رنگ و نسل کی بنیاد پر قوانین بنا کر اونچ نیچ کی تمیز روا رکھی ہے اور دوسری قوموں اور گروہوں پر انسانیت سوز ظلم و ستم ڈھائے ہیں۔ یہودیوں نے اسی بنا پر اسرائیلیوں کو اللہ کی چہیتی قوم قرار دے کر اپنے مذہبی احکام تک میں غیر اسرائیلیوں کے حقوق و مرتبے کو اپنے سے کم رکھا۔ ہندوؤں میں برہمن کا مرتبہ دوسری ذاتوں سے اونچا ہونے کا تصور اسی گمراہی کی بنیاد پر ہے۔ ان اونچی ذات والوں کے مقابلے میں تمام انسان نیچ اور ناپاک قرار دیے گئے، شودروں کو انتہائی ذلیل سمجھا گیا۔ آریائی نسل پرستی کے فلسفے میں برہما کے سر کا درجہ برہمن کو دیا گیا تو بے چارے شودروں کو اس کے پیروں میں ڈال دیا گیا جن کا سایہ بھی برہمن کے لئے "بھرشٹ" کر دینے والا ہے۔ گورے لوگوں نے اپنی نسلی برتری کے زعم میں افریقہ اور امریکہ میں

سیاہ فام لوگوں پر ظلم و ستم ڈھائے اور جنگ عظیم میں نازی جرمنی کے فلسفہ نسلیت اور نازک نسل کی برتری کے تصور نے کس طرح انسانوں کو دوسری قوم کے انسانوں کے لئے درندہ بنادیا!

سورۃ الحجرات کی درج بالا آیت سے یہ بات واضح ہے کہ خالق کائنات نے انسانوں کو اقوام و قبائل میں نسلی برتری کے لئے نہیں تقسیم کیا تھا بلکہ اس لئے کہ خاندانی، قبائلی اور قومی سطح پر باہمی تعارف اور تعاون کے ذریعے معاشرے کی تشکیل و تعمیر کا کام آسان ہو جائے اور پھر اس کو مزید توسیع دے کر بین الاقوامی حد تک لے جایا جائے۔ مگر افسوس کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے صرف تعارف اور پہچان کا ذریعہ بنایا تھا اسے بڑائی و فخر کا ذریعہ بنالیا گیا اور پھر اسی کی بنا پر نوبت ظلم و عدوان تک پہنچادی گئی۔

اللہ کے نزدیک انسانوں میں بڑائی اور فضیلت کی ایک ہی بنیاد ہے اور وہ ہے ایمان و عمل۔ پیدائش کے لحاظ سے تمام انسان برابر ہیں کیونکہ انکا پیدا کرنے والا ایک ہی ہے یعنی اللہ تعالیٰ۔ ان کا مادہ پیدائش اور طریق پیدائش ایک ہی ہے اور ان سب کا سلسلہ نسب ایک ہی ماں باپ یعنی آدم و حوا علیہما السلام تک پہنچتا ہے۔ کسی خاص ملک، قوم یا برادری میں پیدا ہونے میں انسان کے اپنے ارادے یا کوشش کا کوئی دخل نہیں۔ اگر کسی شخص کو دوسرے لوگوں پر فضیلت حاصل ہوتی ہے تو اس بنا پر کہ وہ دوسروں سے زیادہ اللہ پر پختہ ایمان رکھنے والا، اللہ سے ڈرنے والا، برائیوں سے بچنے والا اور نیکی کے راستے پر چلنے والا ہے، چاہے وہ کالا ہو یا گورا، مشرق میں پیدا ہوا ہو یا مغرب میں۔ یہ حقیقت جو قرآن کی ایک مختصر آیت میں بیان کی گئی ہے رسول اللہ ﷺ نے اپنے مختلف خطبات و ارشادات میں اسے تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ فتح مکہ کے موقعے پر طواف کعبہ کے بعد آپ ﷺ نے تقریر کی اور اس میں فرمایا کہ:

الحمد للہ الذی اذھب عنکم عیبۃ الجاھلیۃ وتکبرھا۔ یایھا الناس رجلان بر تقی کریم علی اللہ وفاجر شقی ھین علی اللہ الناس کلھم بنوا ادم و خلق اللہ ادم من تراب (جامع ترمذی کی آخری حدیث کتاب المناقب، باب فی ثقیف و بنی حنیفۃ)

"تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے تم سے جاہلیت کا عیب اور اس کا تکبر دور کر دیا۔ لوگو! انسان دو ہی گروہ میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ایک نیک اور پرہیزگار جو کہ اللہ کی نگاہ میں عزت والا ہے اور دوسرا فاجر و شقی جو اللہ کی نگاہ میں ذلیل ہے ورنہ تو سارے انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم کو اللہ نے مٹی سے پیدا کیا تھا۔"

حجۃ الوداع کے موقعے پر ایام تشریق میں نبی ﷺ نے ایک تقریر میں فرمایا:

یایھا الناس الا ان ربکم واحد لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاسود علی احمر ولا لاحمر علی اسود الا بالتقوی ان اکرمکم عنداللہ اتقکم (بیہقی)

"لوگو! آگاہ رہو کہ تم سب کا رب ایک ہے، کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقوے کی وجہ سے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ متقی ہے۔"

قرآن و حدیث کی ان واضح تعلیمات کے باوجود جہاں اور قوموں میں نسلی اور خاندانی بنیاد پر بڑائی اور دوسروں سے برتر ہونے کی گمراہی پائی جاتی ہے، وہیں خود قرآن و حدیث کو ماننے کا دعویٰ کرنے اور مسلمان کہلانے والوں میں بھی جاہلیت کا یہ تصور ایک وبا کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ اور خاص طور سے برصغیر کے مسلمانوں میں تو ذات پات کی تفریق ہندوؤں سے کسی طرح کم نہیں۔ ہندوؤں میں "برہمن" سب سے اونچی ذات سمجھی جاتی ہے تو مسلمان کہلانے والوں میں "سید ذات" کا مقام سب سے اونچا قرار دیا جاتا ہے۔ "سید" کہلانے والوں کو دوسرے لوگوں سے اونچا اور برتر سمجھا جاتا ہے کہ یہ آل رسول ہیں، بخشے بخشائے ہیں، جنت ان کے لئے ہے، یہ جہنم میں نہیں جاسکتے، دنیا میں بھی اگر "سید" آگ میں ہاتھ ڈالے تو نہیں جلے گا .... حتیٰ کہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سید اور غیر سید کا نکاح بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی کے ماں اور باپ دونوں "سید" ہوں تو اسے "نجیب الطرفین" کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ اپنے سید ہونے کا رعب ڈال کر لوگوں کا مال لوٹتے ہیں، نذرانے وصول کرتے ہیں اور .... آبرو تک بھی برباد کرتے ہیں ...... حالانکہ "سید" نہ تو کسی قوم و خاندان کا نام ہے اور نہ کسی قبیلے کا۔ "سید" ایک عربی لفظ ہے جس کا اردو ترجمہ "سردار" یا "بڑا" ہوتا ہے، چاہے کسی بھی قوم کا سردار ہو، کافر ہو یا مومن ہو، اسے عربی میں "سید" کہیں گے۔ قرآن و حدیث میں لفظ "سید" کا استعمال اس بات کو واضح طور پر بیان کرتا ہے۔ قرآن میں دو مقامات پر "سید" کا لفظ آیا ہے: ایک جگہ یحییٰ علیہ السلام کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سید کے لفظ سے کیا ہے:

مصدقا بکلمۃ من اللہ وسیدا و حصورا و نبیا من الصلحین ﴿۳۹﴾ (آل عمران:۳۹)

"وہ اللہ کی باتوں کی تصدیق کرنے والے، سردار، پاکباز اور صالحین میں سے ہوں گے۔"

دوسری جگہ اللہ نے عزیز مصر کا ذکر سید کے لفظ سے کیا ہے۔ فرمایا:

وقدت قمیصہ من دبر و الفیا سیدھا لدا الباب ط (یوسف:۲۵)

"اس عورت نے اس (یوسف) کی قمیص پیچھے سے پھاڑ دی اور دونوں نے اس (عورت) کے سید (شوہر) کو دروازے کے پاس پایا۔"

یہاں اللہ تعالیٰ نے عزیز مصر کے لئے جو کہ کافر تھا "سید" کا لفظ استعمال کیا کیونکہ وہ اپنی بیوی کا سردار یعنی شوہر تھا۔ تیسرے مقام پر سید کی جمع "سادۃ" استعمال ہوئی ہے:

وقالوا ربنا انا اطعنا سادتنا وکبرآءنا فاضلونا السبیلا ﴿۶۷﴾ (الاحزاب:۶۷)

"اور کہیں گے کہ اے ہمارے رب! ہم نے اپنے سیدوں (سرداروں) اور بڑوں کی اطاعت کی سو انہوں نے ہمیں راہ راست سے بھٹکا دیا۔"

یہاں بھی یہ لفظ کافروں کے سیدوں یعنی سرداروں کے لئے استعمال ہوا ہے جنہوں نے اپنے پیروکاروں کو گمراہ کیا۔ معلوم ہوا کہ قرآن سید نام کا کوئی قبیلہ اور ذات نہیں بتاتا بلکہ اس لفظ کو کافر اور مومن دونوں کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اب احادیث سے لفظ سید کے استعمال کی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

سید کا استعمال مسلمانوں کے لئے

بلال بن رباح رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کے صحابہ میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ نبی ﷺ اور صحابہ ان کی بہت عزت کیا کرتے تھے، لیکن نام و نسب کی وجہ سے نہیں کیونکہ وہ تو ایک حبشی غلام تھے، بلکہ ایمان و عمل کی وجہ سے۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عمرؓ کہا کرتے تھے:

ابوبکر سیدنا واعتق سیدنا یعنی بلالا

(صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب مناقب بلال)

"ابوبکر ہمارے سید (سردار) ہیں اور انہوں نے ہمارے سید (سردار) یعنی بلال کو آزاد کرایا ہے۔"

عمر رضی اللہ عنہ بلال رضی اللہ عنہ کو حسب و نسب کا سید نہیں بلکہ ایمان و عمل میں اخلاص کی بنا پر مسلمانوں کا سید قرار دیتے تھے۔

نبی ﷺ کی وفات کے فوراً بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں خلیفہ رسول کا انتخاب ہوا۔ اس موقعے پر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خلافت کے لئے عمر رضی اللہ عنہ اور ابو عبیدہ بن الجراح کا نام پیش کیا اور کہا کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کی بیعت کی جائے۔ لیکن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

بَل نُبَایِعُکَ اَنتَ فَاَنتَ سَیِّدُنَا وَخَیرُنَا وَاَحَبُّنَا اِلٰی رَسُولِ اللہ

(صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب قول النبی ﷺ لوکنت متخذا خلیلا)

"بلکہ ہم آپ کی بیعت کریں گے کیونکہ آپ ہمارے سید (سردار) ہیں اور ہم میں بہتر اور رسول اللہ کے محبوب ہیں۔"

یہاں بھی عمرؓ نے ابوبکرؓ کو حسب و نسب کا سید نہیں بلکہ مسلمانوں میں ایمان و تقویٰ کے سبب ان کے مقام کے لحاظ سے سید قرار دیا۔

غزوہ خندق کے بعد نبی ﷺ نے یہودیوں کے قبیلے بنو قریظہ کا محاصرہ کر لیا کیونکہ انہوں نے کھلم کھلا عہد شکنی کی تھی۔ چند ہی دنوں میں ان کے کس بل نکل گئے اور انہوں نے اس شرط پر ہتھیار ڈال دیے کہ سعد بن معاذؓ ان کے بارے میں جو فیصلہ کریں گے وہ انہیں منظور ہوگا۔ نبی ﷺ نے سعد بن معاذؓ کو بلوایا۔ وہ غزوہ خندق میں شدید زخمی ہو گئے تھے۔ سعدؓ سوار ہو کر پہنچے تو نبی ﷺ نے صحابہ سے فرمایا:

قُومُوا اِلٰی سَیِّدِکُم

(صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب قول النبی ﷺ قوموا الی سیدکم)

"اپنے سید (سردار) کے لئے کھڑے ہو۔"

سعدؓ کسی سید قوم سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ مسلمانوں میں ان کے مقام کی وجہ سے نبی ﷺ نے ان کے لئے یہ ارشاد فرمایا۔ نیز وہ اپنے قبیلے بنو خزرج کے سردار بھی تھے۔

ایک موقعے پر سعد بن عبادہؓ نے نبی ﷺ کے سامنے کوئی بات کی تو نبی نے صحابہ سے فرمایا:

اِستَمِعُوا اِلٰی مَا یَقُولُ سَیِّدُکُم (صحیح مسلم، کتاب اللعان)

"سنو تمہارے سید (سردار) کیا کہتے ہیں۔"

نبی ﷺ نے سعد بن عبادہؓ کو نسب کے لحاظ سے سید نہیں کہا بلکہ ان کے انصار کے قبیلے اوس کے سردار ہونے کی وجہ سے ان کے لئے سید کا لفظ استعمال کیا۔

جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک غلام نے آ کر نبی ﷺ سے ہجرت پر بیعت کی۔ آپ کو معلوم نہ تھا کہ یہ غلام ہے۔ اس کے بعد:

فَجَآءَ سَیِّدُہٗ یُرِیدُہٗ

(صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ والمزارعہ، باب جواز بیع الحیوان بالحیوان من جنسہ متفاضلا)

"اس کا سید (آقا) اسے لینے کے لئے آیا۔"

یہاں غلام کے آقا کے لئے سید کا لفظ آیا ہے۔ اور اس معنی میں اس کے استعمال کی کثیر مثالیں کتب احادیث میں موجود ہیں۔

نبی ﷺ نے ایک موقعے پر حسن بن علیؓ کے لئے فرمایا:

اِنَّ ابنِی ھٰذَا سَیِّدٌ وَّلَعَلَّ اللہَ اَن یُّصلِحَ بِہٖ بَینَ فِئَتَینِ مِنَ المُسلِمِینَ

(صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب مناقب الحسن والحسین)

"میرا یہ بیٹا سید (سردار) ہے اور شاید اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کرائے گا۔"

حسن کو نبی ﷺ نے سیدزادے والا قرار نہیں دیا بلکہ آئندہ ہونے والے ایک واقعے کی خبر دیتے ہوئے ان کے لئے عزت والا لفظ استعمال کیا۔

احادیث سے مسلمانوں کے لئے لفظ سید کے استعمال کی چند مثالیں پیش کی گئیں جن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سید کا لقب کسی خاص قبیلے یا خاندان کی نسبت کی وجہ سے استعمال نہیں ہوتا بلکہ سردار یا بڑے کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

سید کا استعمال کافروں کے لئے

عائذ بن عمروؓ روایت کرتے ہیں کہ ابو سفیان (صلح حدیبیہ کی تجدید کے لئے جب مدینے آئے تھے اور اس وقت تک کافر ہی تھے تو) سلمان، صہیب اور بلال رضی اللہ عنہم کے پاس سے گذرے۔ انہوں نے کہا: "کیا اللہ کے دشمن کی گردن سے اللہ کی تلواروں نے ابھی تک اپنا حق وصول نہیں کیا؟" اس پر ابوبکرؓ نے ان صحابہ سے مخاطب ہو کر کہا:

اَتَقُولُونَ ھٰذَا لِشَیخِ قُرَیشٍ وَّسَیِّدِھِم

(صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل سلمان و صہیب و بلال)

"تم قریش کے شیخ اور ان کے سید (سردار) کے لئے ایسی بات کہتے ہو۔"[1]

کیا ابو سفیان کسی سید قوم سے تعلق رکھتے تھے؟

عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ سعد بن معاذؓ (ہجرت سے پہلے) عمرہ کرنے گئے اور وہاں امیہ بن خلف کے پاس ٹھہرے۔ دوپہر کے وقت وہ طواف کر رہے تھے کہ ابو جہل نے دیکھ لیا۔ اس نے غصے سے کہا کہ تم نے محمد اور ان کے ساتھیوں کو پناہ دے رکھی ہے اور اطمینان سے طواف کر رہے ہو۔ سعد بن معاذؓ اور ابو جہل میں تلخ کلامی ہونے لگی تو امیہ بن خلف نے سعدؓ سے کہا:

لَا تَرفَع صَوتَکَ عَلٰی اَبِی الحَکَمِ فَاِنَّہٗ سَیِّدُ اَھلِ الوَادِی

(صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ فی الاسلام)

"ابو الحکم (ابو جہل) کے سامنے آواز بلند نہ کرو کیونکہ وہ اس وادی والوں کا سید (سردار) ہے۔"

ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ صحابہؓ کی ایک جماعت سفر پر تھی۔ وہ عرب کے قبائل میں سے ایک قبیلے کے پاس پہنچے اور ان سے مہمان نوازی کے لئے کہا، لیکن قبیلے والوں نے مہمان نوازی سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد:

فَلُدِغَ سَیِّدُ ذٰلِکَ الحَیِّ

(صحیح بخاری، کتاب الاجارۃ، باب ما یعطی فی الرقیۃ علی احیاء العرب بفاتحۃ الکتاب)

"قبیلے کے سید (سردار) کو کسی زہریلے جانور نے ڈس لیا۔"

وہ قبیلہ کافروں کا تھا جب ہی تو انہوں نے صحابہؓ کی مہمان نوازی سے انکار کر دیا۔ لیکن ان کا سردار بھی ان کا "سید" تھا۔

باقی صفحہ 39 پر

[1] اسی حدیث میں آگے ہے کہ نبی ﷺ نے ابوبکرؓ سے کہا کہ تم نے اگر اپنے بھائیوں کو ناراض کیا تو اللہ تم سے ناراض ہو جائے گا۔ ابوبکرؓ بولے تو میری بات سے تم کو ناراضی ہوئی؟ وہ بولے نہیں، اور ابوبکرؓ نے ان صحابہؓ سے معذرت کی۔

عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ

سعید احمد

بیعت عقبہ کے بعد جب اسلام کی روشنی مدینہ میں پہنچی تو ظلمت کی سیاہی دور ہونے لگی۔ مدینے کے دو بڑے قبیلے اوس اور خزرج ایمان کی نعمت سے بہرہ ور ہو گئے۔ وہ زمانہ جاہلیت میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان میں برسوں جنگیں برپا رہتی تھیں لیکن ایمان لانے کے بعد انکی حمیت جاہلیت اسلامی مواخات میں تبدیل ہو گئی۔ مگر مدینے ہی میں آباد اہل کتاب یہودی قبائل اسلام کی طرف نہ بڑھے۔ انھیں اس بات کا غرور تھا کہ وہ حامل کتاب ہیں اور انبیاء علیہم السلام کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگرچہ عرب کے عام لوگوں کی طرح ان کے ایمان میں بھی شرک کی ملاوٹ تھی اور اللہ کے نازل کردہ دین سے جس کے وہ دعویدار تھے، بہت دور ہو چکے تھے۔ پھر بھی دعویٰ کرتے تھے کہ نجات اور جنت کے حقدار صرف وہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مدنی سورتوں میں ان کے دعوے بیان کر کے انکار دیا ہے، اور انھیں عقیدۂ توحید اختیار کرنے اور اپنے آخری رسول ﷺ اور کتاب اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے۔ لیکن سب اہل کتاب ایک جیسے نہیں، ان میں چند ایسے اہل ذکر و فکر اور حق گو لوگ بھی تھے جنھوں نے سچائی کو پہچان لیا اور اپنی قوم و قبیلے کی پروا نہ کرتے ہوئے ایمان کی دعوت کو قبول کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اہل کتاب کے ایسے لوگوں کا ذکر کیا ہے:

لَيْسُوْا سَوَآءً ۚ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ..... وَ اُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿﴾ (آل عمران:۱۱۳، ۱۱۴)

"سب اہل کتاب یکساں نہیں، ان میں ایک گروہ عہد پر قائم ہے، وہ راتوں کو اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں، اور سر بسجود رہتے ہیں۔ وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں اور نیک کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔ یہی صالح لوگ ہیں۔"

دوسری جگہ ان صالح اہل کتاب کا ذکر اس طرح کیا گیا:

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۗ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿﴾ (آل عمران:۱۹۹)

"اور اہل کتاب میں بعض ایسے ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور اس پر جو نازل کیا گیا تم پر اور جو نازل کیا گیا ان پر، اللہ سے ڈرنے والے ہیں، اللہ کی آیات کو قلیل معاوضے پر بیچتے نہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، بلاشبہ اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔"

اہل کتاب کے ان چند سعید الفطرت لوگوں میں عبداللہ بن سلام بھی تھے، جو کہ ایمان لانے سے پہلے یہودیوں کے بہت بڑے عالم تھے۔ ان کا تعلق یہودیوں کے قبیلے بنو قینقاع سے تھا (صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث بنی نضیر) نبی ﷺ کی مدینے آمد سے پہلے ہی ان تک اسلام کا پیغام پہنچ چکا تھا، لیکن وہ چاہتے تھے کہ نبی ﷺ کی دعوت خود انہی کی زبانی سنیں اور فیصلہ کریں۔ چنانچہ جب نبی ﷺ کے ہجرت فرما کر مدینہ آنے کی خبر انھیں ملی تو اس وقت وہ اپنے کھجوروں کے ایک باغ میں کھجوریں جمع کر رہے تھے۔ آمد کی خبر سنتے ہی کھجوریں ہاتھ میں لیے عجلت نبی ﷺ کے پاس پہنچے۔ نبی ﷺ ابھی اپنے میزبان ابو ایوب انصاریؓ کے گھر کے باہر ہی تھے۔ عبداللہ بن سلام نے نبی ﷺ سے کچھ باتیں کیں (بخاری، کتاب الانبیاء، باب ہجرۃ النبی و اصحابہ)۔ ترمذی نے کتاب صفۃ القیامۃ کے ابواب میں اس گفتگو کو روایت کیا ہے۔ عبداللہ بن سلامؓ بیان کرتے ہیں کہ جب نبی ﷺ مدینے تشریف لائے تو میں نے نبی ﷺ کے چہرے کو دیکھ کر پہچان لیا کہ یہ کسی جھوٹے کا چہرہ نہیں۔ جو پہلی بات نبی ﷺ نے اس وقت کہی وہ یہ تھی کہ تم ان سب کو سلام کرو جن سے ملو، کھانا کھلاؤ، اپنے رشتے داروں کا خیال رکھو، رات کے وقت جب لوگ سو رہے ہوں تو نماز پڑھو، اور جنت میں داخل ہو جاؤ۔

کچھ وقفے کے بعد عبداللہؓ دوبارہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نبی ﷺ سے کہا کہ میں تین چیزوں کے متعلق پوچھوں گا جنہیں نبی کے سوا کوئی نہیں جانتا: قیامت کی پہلی نشانی کیا ہے؟ اہل جنت کی ضیافت کے لئے سب سے پہلے کیا چیز پیش کی جائے گی؟ بچہ کب اپنے باپ کی شکل و صورت پر جاتا ہے اور کب اپنی ماں کی شکل و صورت پر؟ نبی ﷺ نے فرمایا: مجھے ابھی جبریل علیہ السلام نے آکر ان باتوں کی خبر دی ہے۔ عبداللہؓ بولے جبریل نے؟ نبی ﷺ نے فرمایا ہاں۔ انھوں نے کہا کہ وہ تو یہودیوں کے دشمن ہیں۔ نبی ﷺ نے سورۃ البقرہ کی آیت (۹۷) تلاوت فرمائی:

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ......

"کہہ دو کہ جو جبریل کا دشمن ہے تو (اسے معلوم ہو کہ) اس نے آپ کے دل پر یہ (قرآن) اللہ کے حکم سے اتارا ہے"

پھر نبی ﷺ نے ان کے سوالات کے جواب دیے کہ قیامت کی پہلی نشانی ایک آگ کی صورت میں ظاہر ہوگی، جو تمام انسانوں کو مشرق سے مغرب کی طرف جمع کر لائے گی۔ اور اہل جنت کی ضیافت کے لئے جو کھانا سب سے پہلے پیش کیا جائے گا وہ مچھلی کے جگر کا ایک قیمتی ٹکڑا ہوگا، اور جب مرد کا پانی عورت کے پانی پر سبقت کر جاتا ہے تو بچہ باپ پر

پڑتا ہے اور جب عورت کا پانی مرد کے پانی پر سبقت کر جاتا ہے تو بچہ ماں پر پڑتا ہے۔ عبداللہ بول اٹھے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ پھر کہا کہ اے اللہ کے رسول! یہود وہی بہتان تراش قوم ہے۔ اگر میرے ایمان کا آپ ان کو بتانے سے پہلے انہیں علم ہو گا تو مجھ پر پہلے ہی سے بہتان تراشیاں شروع کر دیں گے۔ چنانچہ کچھ یہودی آگئے۔ عبداللہ بن سلام گھر میں چھپ گئے۔ نبی ﷺ نے ان یہودیوں سے دریافت کیا کہ عبداللہ بن سلام تم میں کیسے سمجھے جاتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ وہ ہم سب میں بہتر اور سب سے بہتر کے بیٹے اور ہمارے سردار اور سردار کے بیٹے ہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا "اگر وہ اسلام لے آئے تو پھر تمہارا کیا خیال ہو گا؟" وہ کہنے لگے کہ اللہ انہیں اس سے اپنی پناہ میں رکھے۔ عبداللہ بن سلام باہر آگئے اور کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اب یہودیوں نے پینترا بدلا اور کہنے لگے کہ یہ ہم میں سب سے بدتر ہے اور سب سے بدتر کا بیٹا ہے۔ غرضیکہ ان کی اہانت اور برائی شروع کر دی۔ عبداللہ بن سلامؓ نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! مجھے اسی چیز کا اندیشہ تھا۔

(صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ واذ قال ربک للملائکۃ — کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ البقرۃ باب قولہ من کان عدوا لجبریل)

اس واقعے میں بڑی عبرت و نصیحت ہے۔ ایک طرف تو گمراہی میں مبتلا قوم یہود ہے جن کے سامنے حق پوری طرح واضح ہو گیا اور ان کے ایک بڑے قابل احترام عالم نے اس کے حق ہونے کی شہادت دی اور قبول کر لیا لیکن دیگر یہودی علماء نے ضمیر کی آواز کو دبایا، وہ ڈھیلے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً ہی اپنا رخ بدل دیا اور جو کچھ خود کہا تھا اس کو زبان کی دوسری کروٹ سے رد کر دیا۔ دوسری طرف حق کے متلاشی عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا کردار ہے کہ جیسے ہی انہوں نے سچائی دیکھی، اسے آگے بڑھ کر قبول کر لیا اور نہ تو اپنے بڑے عالم ہونے کا غرور کیا اور نہ ہی اپنی قوم اور قبیلے میں اپنے مقام کے ختم ہو جانے کا خیال انہیں سچے دین کو قبول کرنے سے روک سکا بلکہ اللہ کی رضا و خوشنودی کے لئے انہوں نے ان ساری چیزوں کو پیچھے ڈال دیا۔

ایمان لانے کے بعد عبداللہ بن سلام اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سچے اطاعت گذار بن گئے۔ وہ اللہ کی نافرمانی سے بہت زیادہ ڈرنے والے اور اس کی رضا و خوشنودی کو ہر چیز پر ترجیح دینے والے تھے۔ عبداللہ بن سلامؓ صحیح معنوں میں درج ذیل آیت کا پیکر تھے:

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر: ۲۸)

"فی الحقیقت اللہ کے بندوں میں صرف علم والے ہی اللہ سے ڈرتے ہیں۔"

یعنی اللہ کی نظر میں عالم وہی ہیں جو کتاب اللہ کے علم کے ساتھ خوف و خشیت کے حامل بھی ہوں۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے جنت کی نعمتوں کا وعدہ ہے۔ عبداللہ بن سلام اس صفت سے متصف تھے، چنانچہ نبی ﷺ نے ان کی زندگی ہی میں انہیں جنت کی خوشخبری دے دی تھی۔

سعد بن ابی وقاصؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ سے عبداللہ بن سلام کے سوا کسی کے متعلق یہ نہیں سنا کہ وہ اہل جنت میں سے ہے۔

(صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب مناقب عبداللہ بن سلامؓ)

عبداللہ بن سلامؓ کی طبیعت میں انکساری بہت تھی:

قیس بن عباد بیان کرتے ہیں کہ میں مسجد نبوی میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک بزرگ داخل ہوئے ان کے چہرے پر خشوع و خضوع کے آثار نمایاں تھے۔ لوگوں نے کہا کہ یہ اہل جنت میں سے ہیں۔ پھر انہوں نے دو رکعات مختصر طریقے پر پڑھیں۔ پھر باہر نکل گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے چل دیا اور ان سے کہا کہ جب آپ مسجد میں داخل ہوئے تو لوگوں نے کہا تھا کہ یہ بزرگ اہل جنت میں سے ہیں۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ اللہ کی قسم کسی کیلئے ایسی بات زبان سے نکالنا درست نہیں، جسے وہ جانتا نہ ہو، میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ایسا کیوں ہوا۔ نبی ﷺ کے دور میں ایک خواب میں نے دیکھا تھا اور نبی ﷺ سے اسے بیان کیا تھا۔ میں نے خواب یہ دیکھا تھا کہ جیسے میں ایک باغ میں ہوں۔ پھر آپؐ نے اس کی وسعت اور اس کے سبزہ زاروں کا ذکر کیا اور بتایا کہ اس باغ کے درمیان میں لوہے کا ایک ستون ہے، جس کا نچلا حصہ زمین میں ہے اور اوپر کا آسمان میں اور اس کی چوٹی پر ایک حلقہ ہے۔ مجھ سے کہا گیا کہ اس پر چڑھ جاؤ۔ میں نے کہا کہ مجھ میں تو اتنی طاقت نہیں ہے۔ اتنے میں ایک خادم آیا اور پیچھے سے اس نے میرے کپڑے اٹھائے تو میں چڑھ گیا اور جب اس کی چوٹی پر پہنچ گیا تو میں نے اس حلقے کو پکڑ لیا۔ مجھ سے کہا گیا کہ اسے مضبوطی سے پکڑے رہو۔ میں اسے پکڑے ہوئے ہی تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ یہ خواب جب میں نے نبی ﷺ سے بیان کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ جو باغ تم نے دیکھا وہ اسلام ہے۔ اس میں جو ستون ہے وہ اسلام کا ستون ہے اور وہ حلقہ عروۃ الوثقیٰ ہے۔ تم اسلام پر موت تک قائم رہو گے۔ یہ بزرگ عبداللہ بن سلام تھے۔ (بخاری: ایضاً)

عبداللہ مشتبہ اور ناجائز چیزوں سے خود بھی بہت زیادہ بچتے تھے اور دوسروں کو بھی بچنے کی تلقین کرتے تھے۔ ابو بردہ بیان کرتے ہیں کہ:

میں مدینے آیا تو عبداللہ بن سلام سے ملاقات کی۔ انہوں نے مجھ سے کہا "آؤ میں تمہیں ستو اور کھجور کھلاؤں، اور تم ایک (معزز) گھر میں داخل ہو گے۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ تمہارا قیام ایسی جگہ میں ہے جہاں سودی معاملات بہت عام ہیں، سو اگر تمہارا کسی شخص پر کوئی حق (قرض وغیرہ) ہو اور وہ تمہیں ایک گٹھا بھوسے کا، ایک دانے یا ایک گھاس کے بوجھ کا بھی تحفہ دے تو تم قبول نہ کرنا کیونکہ یہ بھی سود ہو جائے گا۔ (ایضاً)

اس سے ان کی معاملات میں تقوے کی روش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسلام سے پہلے عبداللہ بن سلامؓ یہودیوں کے عالم تھے۔ اسلام لانے کے بعد دین اسلام کا علم بھی اسی طرح ذوق و شوق سے حاصل کیا۔ چنانچہ معاذ بن جبلؓ سے ان کی وفات کے وقت کہا گیا کہ:

"اے ابو عبدالرحمن ہمیں کوئی وصیت فرمائیں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے بٹھاؤ۔ پھر فرمایا کہ علم اور ایمان اپنی جگہ پر ہیں، جو کوئی انہیں طلب کرے گا پا لے گا۔ اس بات کو تین مرتبہ فرمایا۔ پھر کہا: علم چار شخصوں سے سیکھو۔ عویمر یعنی ابو الدرداءؓ سے، اور سلمان فارسیؓ سے، اور عبداللہ بن مسعودؓ سے اور عبداللہ بن سلامؓ سے جو پہلے یہودی تھے اور پھر اسلام لے آئے تھے۔ میں نے نبی ﷺ سے سنا ہے کہ جنت میں داخل ہونے والے یہ دسویں ہوں گے۔"

(ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب عبداللہ بن سلامؓ)

عبداللہ عالم باعمل ہونے کے ساتھ مجاہد فی سبیل اللہ بھی تھے۔ غزوہ بدر و غزوہ احد کے شرکاء میں تو ان کا تذکرہ نہیں ملتا۔ شاید کسی وجہ سے ان غزوات میں وہ شرکت نہ کر سکے۔ لیکن مورخین نے بعد کے غزوات خصوصاً غزوہ احزاب کے شرکاء میں عبداللہ کا ذکر کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں صحابہ رضی اللہ عنہم سے محبت اور ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دین اسلام پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

عیدِ میلاد النبیؐ

محمد آصف

بلاشبہ اللہ کے نبی ﷺ سے محبت ایمان کا لازمی حصہ ہے جس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ زبان رسالت نے اس کی اہمیت کو ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے:

لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین (صحیح بخاری کتاب الایمان)

"تم میں سے اس وقت تک کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اسے اس کے والدین، اولاد اور تمام انسانوں سے زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں۔"

نبی ﷺ کی رسالت پر ایمان رکھنے والا کوئی شخص ان کی محبت سے خالی یا عاری نہیں ہو سکتا۔ اس معاملے میں نہ تو کسی قسم کے اختلاف کی گنجائش ہے اور نہ ہی کسی کو اختلاف ہے۔ ہاں، اختلاف ہے تو اس بات پر کہ نبی ﷺ سے محبت کا انداز اور معیار کیا ہو۔ آج امت کی ایک بڑی اکثریت نبی ﷺ کے احکام و فرامین سے بے پرواہ ہو کر ان کی تعریف میں غلو پر مبنی شرکیہ نعتیں ترنم سے گانے کو محبت کا نام دیتی ہے، یا رسول اللہ کا نعرہ لگانے کو فعلِ محبت سمجھتی ہے، آپ ﷺ کو حاضر و ناظر، مختار کل، غائبانہ مدد کو پہنچنے اور کائنات میں تصرف کا اختیار رکھنے والا سمجھنے کو محبت قرار دیتی ہے، اور نبی ﷺ کا یوم ولادت "عید میلاد النبی" کے نام سے بطور جشن منانے کو حبِ نبی قرار دیتی ہے؛ اس دن کو نبی ﷺ کی ولادت کے حوالے سے "بڑا دن" بتا کر من گھڑت روایات اور خود ساختہ قصے بیان کرنے کو باعث ثواب سمجھتی ہے۔ اس دن جلسے، جلوس اور چراغاں کا اہتمام کیا جاتا ہے، شیرینیاں تقسیم کی جاتی ہیں، دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دی جاتی ہے اور یہ سب کچھ نبی ﷺ سے محبت کا تقاضا سمجھا جاتا ہے اسی لئے ایسا نہ کرنے والوں کو یہ لوگ محبتِ رسولؐ سے خالی قرار دیتے ہیں۔ چاہے انہیں کتنا ہی سمجھایا جائے کہ نبی ﷺ سے محبت کا یہ انداز قرآن و حدیث میں نہیں بتایا گیا، جو چیز دین میں نہیں اس کی کوئی حیثیت نہیں، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات میں یہ چیزیں نہیں پائی جاتیں، بلکہ نبی علیہ السلام نے تو دین میں نئی چیزیں ایجاد کرنے سے منع فرمایا ہے:

من احدث فی امرنا ھذا مالیس منہ فھو ردٌ

"جس نے ہمارے دین میں کوئی نئی بات نکالی جو اس میں نہ تھی، وہ قابل رد ہے۔"

(متفق علیہ، بحوالہ مشکوۃ، باب الاعتصام)

من عمل عملاً لیس علیہ امرنا فھو ردٌ

"جو کوئی ایسا کام کرے جس کا ہم نے حکم نہیں دیا تو وہ قابل رد ہے۔"

(صحیح بخاری کتاب البیوع، باب النجش / صحیح مسلم کتاب الاقضیہ باب نقض الاحکام الباطلہ)

لیکن پھر بھی انہیں مطعون کیا جاتا ہے اور ان پر توہین رسالت بلکہ منکرِ رسالت ہونے کے فتوے لگائے جاتے ہیں۔ اس صورتحال میں ضروری ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ سے محبت کے صحیح انداز کو قرآن و حدیث کے حوالے سے واضح کیا جائے تاکہ حب رسولؐ کے درست معیار کو اپنایا جائے اور غلط طرز عمل کی اصلاح کر لی جائے۔

اس سلسلے میں اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا:

من احبّ سنّتی فقد احبّنی ومن احبّنی کان معی فی الجنۃ

(جامع ترمذی بحوالہ مشکوۃ، کتاب الایمان)

"جس نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔"

اس فرمان رسول ﷺ سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ سے محبت دراصل نبی ﷺ کی سنت اور ان کے طریقے پر چلنے کا نام ہے۔ جو اپنی زندگی کو سنت کے رنگ میں رنگ لے وہی صحیح معنوں میں نبی ﷺ سے محبت کرنے والا ہے۔ نبی ﷺ کی سنت سے ہٹ کر نبی ﷺ سے محبت کے دعوے خود نبی ﷺ کی حدیث کے مطابق باطل محض ثابت ہوتے ہیں۔ یہ بھی خیال رہے کہ سنت وہی طریقہ ہے جسے نبی ﷺ نے اختیار کیا ہے اور کوئی ایسا کام جو نبی ﷺ کر سکتے تھے لیکن آپ ﷺ نے نہیں کیا، اسے نہ کرنا ہی سنت ہے۔ کسی نیک کام میں سنت رسولؐ سے تجاوز یعنی آگے بڑھ جانا بھی سنت سے ہٹ جانے ہی کی ایک شکل ہے۔ سنت سے تجاوز کرنے والے کا اقدام ظاہر کرتا ہے کہ اس کے خیال میں (نعوذ باللہ) سنت رسولؐ ناقص ہے اور اس میں اضافے کی ضرورت ہے۔ ایسا کرنے والوں کے لئے درج ذیل واقعہ انتہائی سبق آموز ہے۔

"انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کی ازواج کے پاس تین آدمی آئے اور نبی ﷺ کی عبادت کے متعلق پوچھا۔ ان کو اس کی خبر دی گئی، انہوں نے اس کو تھوڑا جانا اور کہنے لگے، ہماری نبی ﷺ کے ساتھ کیا نسبت ہے؟ اللہ تعالیٰ نے آپ کی اگلی پچھلی خطائیں معاف فرما دی ہیں۔ ایک آدمی نے کہا کہ میں ہمیشہ ساری رات نماز پڑھا کروں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ دن کو روزہ رکھوں گا اور افطار نہ کروں گا۔ تیسرے آدمی نے کہا کہ میں عورتوں سے الگ رہوں گا اور کبھی نکاح نہ کروں گا۔ نبی ﷺ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے ان سے پوچھا کہ تم نے ایسی ایسی باتیں کہی ہیں؟ خبردار! اللہ کی قسم میں تمہاری نسبت اللہ سے بہت ڈرتا ہوں اور تم سب سے زیادہ متقی ہوں۔ لیکن میں رات کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں اور نہ بھی رکھتا ہوں، اور عورتوں سے نکاح بھی کئے ہیں۔ جس نے میرے طریقے سے منہ موڑا وہ مجھ سے نہیں۔" (صحیح بخاری کتاب النکاح)

ہمیشہ رات بھر عبادت کرنا یا ہمیشہ روزہ رکھنا بظاہر کوئی برا کام معلوم نہیں ہوتا، لیکن چونکہ یہ نبی ﷺ کی سنت نہیں بلکہ سنت سے تجاوز ہے، اس لئے نبی ﷺ نے ایسا کرنے والے کے متعلق فرمایا کہ "فلیس منی" "یعنی اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ اسطرح اللہ کے نبی ﷺ نے ایسا کرنے والوں سے بیزاری کا اظہار فرمایا۔

اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ نبی ﷺ کی سنت سے محبت ہی نبی ﷺ سے محبت ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آج جس طرح نبی ﷺ سے محبت کا اظہار کیا جاتا ہے اور پھر اسی پر اصرار بھی کیا جاتا ہے، اس کا ثبوت کہیں سنت میں بھی ملتا ہے یا نہیں۔ ہمارے پاس اللہ کی آخری کتاب محفوظ شکل میں موجود ہے اور نبی ﷺ کی سنت احادیث صحیحہ کی صورت میں۔ ان دونوں کا مطالعہ کر لیا جائے، کوئی ایک آیت یا کوئی ایک صحیح حدیث بھی ایسی نہ ملے گی جو مروجہ عید میلاد النبیؐ منانے کے لئے دلیل بن سکے۔ مل بھی کیسے سکتی ہے کیونکہ اگر قرآن وسنت میں ایسی کوئی دلیل ملتی تو سب سے پہلے صحابہ کرامؓ یہ "عید" مناتے کیونکہ وہ آج کے ان نام نہاد عاشقان رسول سے کہیں زیادہ اور صحیح معنوں میں نبی ﷺ سے محبت کرنے والے تھے۔ وہ تو زندگی بھر دو ہی عیدیں مناتے رہے۔

ایسی صورتحال میں نبی ﷺ کی ولادت کے حوالے سے اس دن عید منانے، جلوس نکالنے، گلیاں اور عمارتیں قمقموں سے سجانے، مصنوعی آرائشی محرابیں بنانے، خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کے گتے اور کاغذ کے تعزیوں کی طرح ماڈل بنا کر انکا طواف کرنے، مٹھائیاں اور حلوے تقسیم کرنے کی کیا دینی حیثیت رہ جاتی ہے اور ان سب کو کس درجے میں "حب رسول" قرار دیا جا سکتا ہے کہ جو کام نبی ﷺ کی سنت نہیں وہی محبت رسولؐ کا معیار بن جائے؟ یہ سب کچھ سنت سے انحراف اور تجاوز ہے جو کسی بھی صورت میں پسندیدہ نہیں۔ دین نام ہی قرآن وسنت کا ہے۔ دین کی حدود سے آگے بڑھنا ہی گمراہی وضلالت ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے نہ تو عقل وخرد کے بلند معیار کی ضرورت ہے اور نہ ہی آگہی ومعرفت کے کوئی خاص علوم درکار ہیں۔ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شخص کو جس نے ان سے تقدیر کے متعلق سوال کیا تھا یہی جواب دیا تھا کہ

"میں تجھے اللہ سے ڈرنے اور اس کے حکم پر چلنے کی وصیت کرتا ہوں اور نبی ﷺ کی سنت پر چلنے کی بھی تاکید کرتا ہوں۔ جو باتیں بدعتیوں نے نکالی ہیں انہیں چھوڑ دو۔ انہوں نے یہ باتیں اس وقت نکالیں جبکہ رسول اللہ کی سنت جاری ہو چکی تھی اور یہ لوگ یہ باتیں ایجاد کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے تھے۔ تو تم پر سنت پر عمل کرنا لازم ہے کہ اس سے تم گمراہی سے بچو گے۔ تم اپنے لئے وہی راستہ اختیار کرو جسے اصحاب رسول نے اختیار کیا تھا۔ وہ دینی فضیلت والے اور دوررس نگاہ والے تھے، اور جن کاموں سے انہوں نے منع کیا تو درست ہی منع کیا، کیوں کہ وہ دین کو ہم سے زیادہ سمجھنے والے تھے۔ آج جو لوگوں نے نئے نئے طریقے نکال رکھے ہیں اگر یہ ہدایت کا راستہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ دین کے معاملے میں صحابہؓ سے بھی آگے بڑھے ہوئے ہیں۔" (سنن ابی داود، کتاب السنۃ، باب فی لزوم السنۃ)

دیکھئے عمر ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے کتنی شدت سے نبی علیہ السلام اور صحابہ کرامؓ کے راستے کو چھوڑ کر بدعت کی روش اپنانے والوں کو تنبیہ فرمائی ہے۔ قرآن نے بھی اس کی شدید مذمت کی ہے:

وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴿ (النساء:۱۱۵)

"اور جو شخص ہدایت واضح ہونے کے بعد رسول کی مخالفت کرے اور مومنوں کے راستے کے سوا کسی اور راستے پر چلے تو جدھر وہ چلتا ہے ہم اسے ادھر ہی چلنے دیں گے اور (قیامت کے دن) جہنم میں داخل کریں گے، اور وہ بری جگہ ہے۔"

مندرجہ بالا آیت میں یہ واضح کر دیا گیا کہ نبی کی تعلیمات کی مخالفت کرنے اور مومنین (یعنی صحابہ کرامؓ) کے راستے کو چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنے کا انجام جہنم ہے۔

آج موجودہ معاشرے میں کفر والحاد کا بھی زور ہے اور بدعات وخرافات کا بھی دور دورہ ہے۔ دین اپنی خالص اور اصلی صورت میں قرآن وحدیث کی حد تک ہی رہ گیا ہے۔ عملاً تو دین کی خود ساختہ صورت ہی ہر طرف رائج ہے۔ دن بہ دن نئی نئی بدعات دین کے نام سے رائج ہوتی جا رہی ہیں۔ عید میلاد النبیؐ کے نام سے نئی عید بھی ان ہی خود ساختہ بدعات میں سے ایک ہے۔ اسے رائج کرنے میں ہمارے یہاں کے نام نہاد علماء کا بڑا دخل ہے کیونکہ اس کا سب سے زیادہ فائدہ انہی کو ہوتا ہے۔ یہ فن دینداری کے ماہر اور علمی موشگافیوں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان بدعات کو جائز ثابت کرنے کے لئے آئے دن کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑتے رہتے ہیں۔ اس نو ایجاد کردہ "عید میلاد النبیؐ" کو ثابت کرنے کے لئے ان لوگوں نے چند عجیب وغریب قسم کے دلائل بھی تراش لئے ہیں۔ اگلی سطور میں انہیں بیان کر کے قرآن وحدیث کی روشنی میں ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔

جشن میلاد منانے کی دلیل کے طور پر سورۃ یونس کی آیت ۵۸ پیش کی جاتی ہے۔ آیت اور ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ﴿ (یونس:۵۸)

"آپ فرما دیں کہ (قرآن کا نزول اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہے تو اس پر انہیں خوش ہونا چاہئے، یہ ان چیزوں سے کہیں بہتر ہے جو وہ جمع کر رہے ہیں۔"

یہ آیت پیش کر کے کہا جاتا ہے کہ اس میں نزول قرآن پر خوشی منانے کا حکم دیا گیا ہے، اور قرآن کا نازل ہونا، نصیحت، شفا، ہدایت ورحمت سب کچھ نبی ﷺ کی پیدائش اور تشریف آوری پر موقوف ہے اور قرآن سے بڑی رحمت ونعمت تو خود نبی ﷺ کی ذات گرامی ہے، لہٰذا نبی ﷺ کی ذات مقدسہ کے ظہور پر جتنی بھی خوشی منائی جائے کم ہے۔

ان حضرات کی بیشتر بدعات کا یہی حال ہے کہ جس آیت کو دلیل میں پیش کرتے ہیں اس میں اس چیز کا کوئی ذکر ہی نہیں ہوتا جسے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سورۃ یونس کی درج بالا آیت میں اللہ کی رحمت پر خوش ہونے کا حکم ہے، اس سے "عید میلاد" منانے کا جواز کیسے نکل آیا؟ کیا اس آیت سے رسول اللہ ﷺ نے جن پر یہ آیت نازل ہوئی، یہ سمجھا کہ عید میلاد منانی چاہیئے؟ صحابہ کرامؓ نے یہ سمجھا کہ اس آیت سے عید میلاد منانا ثابت ہو رہا ہے؟ یا پھر صحابہؓ کے شاگرد و تابعین اور ان کے بعد تبع تابعین نے اس آیت سے عید میلاد کا جواز نکالا؟ تو جس آیت میں اللہ کے نبیؐ کو عید میلاد نظر نہیں آئی، صحابہ کرامؓ کو نظر نہیں آئی، تابعین و تبع تابعین اور محدثین کو نظر نہیں آئی، آج کئی صدیوں کے بعد اس آیت سے عید میلاد کا جواز کیسے نکل آیا؟ پھر یہ کہ بلاشبہ نزول قرآن پر ہر مومن کو خوشی ہونی چاہئے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہدایت ورحمت کا

ذریعہ ہے، اور ظاہر ہے کہ صحابہؓ کو ہم سے زیادہ خوشی تھی جنھوں نے اس سے پورا فائدہ حاصل کیا، مگر انھوں نے خوشی کا اظہار چراغاں کر کے یا جلسے جلوس کر کے نہیں بلکہ اس پر عمل کر کے کیا۔ یہ نہیں کہ قرآن کے نزول کی خوشی میں گلی کوچوں کو سجائیں، گھروں اور عمارتوں پر چراغاں کریں، لیکن عملی طور پر قرآن کی تعلیم سے دور ہٹے ہوئے ہوں! کیا خوشی منانے کے یہ طریقے جو آج رائج ہیں نبی ﷺ اور صحابہؓ سے بھی ثابت ہیں؟ ایسا نہ کرنے والے کو یہ کہا جاتا ہے کہ اسے نبی ﷺ سے محبت نہیں ہے! صحابہ کرامؓ کی زندگیاں تو ایسی ہم نما محبت سے قطعاً خالی ملیں گی۔ پھر یہ کہنا کہ قرآن کا نزول نبی ﷺ کی بدولت ہے، دین کی روح سے ناواقفیت کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا دین کسی کا محتاج نہیں۔ اللہ اپنے دین کا کام جس انسان سے لیتا ہے اس میں اس کا اپنا کوئی کمال نہیں۔ یہ تو اللہ کی عطا اور انعام ہے کہ اللہ کسی بندے سے اپنے دین کا کام لے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو منصبِ رسالت کے لئے منتخب کیا تو یہ آپ ﷺ پر اللہ کا انعام تھا جس کے لئے نبی ﷺ ہمیشہ شکر گزار رہے اور کبھی اس کو اپنا ذاتی کمال بتا کر فخر نہ کیا۔

جشن میلاد منانے والے کہتے ہیں کہ اللہ نے اپنی نعمتوں کو بیان کرنے کا حکم دیا ہے:

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (الضحیٰ:۱۱)

"اپنے رب کی نعمت کو بیان کرو۔"

اور نبی ﷺ اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہیں لہٰذا اس دن عید منانا اور اللہ کی اس نعمت کا تذکرہ کرنا جائز ہے۔ بلاشبہ نبی ﷺ اللہ کی عظیم نعمت ہیں لیکن اس سے عید میلاد منانے کا ثبوت کیسے نکل آیا؟ اگر محض نعمت ہونے سے عید کا جواز مل جاتا ہے تو پھر تو بے شمار عیدیں منانی چاہئیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (ابراھیم ۳۴)

"اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو انہیں گن نہ سکو گے۔"

اللہ کی نعمتیں بے شمار ہیں، کہاں تک عیدیں منائی جائیں گی؟ اگر یہ کہا جائے کہ فلاں نعمت پر عید منائی جائے اور فلاں پر نہیں تو اس کی کیا دلیل ہوگی؟ پھر یہ کہ صحابہؓ بھی جانتے تھے کہ اللہ کے نبی ﷺ عظیم نعمت ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ انھوں نے یہ عید نہیں منائی۔ وہ جانتے تھے کہ اسلام میں شخصیت پرستی کی کوئی حیثیت نہیں اس لئے نہ نبی ﷺ نے اپنی پیدائش کا دن کبھی منایا اور نہ ہی صحابہؓ نے۔ یہ تو عیسائیوں کا طریقہ ہے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے حوالے سے کرسمس مناتے ہیں اور اس کو "بڑا دن" کہتے ہیں۔ اسی طرح ہندو بھی اپنے دیوتا کرشن جی کا جنم دن مناتے ہیں جسے "جنم اشٹمی" کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے مطابق

مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ (سنن ابی داود، کتاب اللباس)

"جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے گا وہ انہی میں شمار کیا جائے گا۔"

لہٰذا ان تمام بدعتوں سے پرہیز لازمی ہے۔

اس دن عید منانے کے جواز کے لئے یہ لوگ اللہ کے دشمن ابولہب کے طرزِ عمل سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ بخاری کتاب النکاح کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ ابولہب کے مرنے کے بعد اس کے بعض گھر والوں نے اسے خواب میں برے حال میں دیکھا اور اس سے اس کا حال پوچھا۔ ابولہب نے بتایا کہ مرنے کے بعد میں نے کوئی راحت نہ پائی سوائے اس کے کہ میں تھوڑا سا سیراب کیا جاتا ہوں اس لئے کہ میں نے ثویبہ کو آزاد کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ابولہب کو جب اس کی باندی ثویبہ نے نبی ﷺ کی ولادت کی خبر دی تو اس نے اس خوشی میں ثویبہ کو آزاد کر دیا تھا، تو جب کافر ابولہب کو نبی ﷺ کی ولادت کی خوشی منانے کا فائدہ ہو سکتا ہے تو ہمیں کیوں نہ ہوگا۔

افسوس کہ ان حضرات کو عید میلاد منانے کی کوئی دلیل نہ تو نبی ﷺ سے ملی نہ صحابہؓ سے بلکہ اس اللہ کے دشمن ابولہب سے ملی جس کا ذکر قرآن میں یوں ہے کہ

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝ (سورۃ لھب:۱)

"ٹوٹ گئے ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ برباد ہو گیا۔"

حالانکہ اس نے تو محمد ﷺ کی پیدائش پر ایک رشتے دار کی حیثیت سے خوش ہو کر اپنی باندی ثویبہ کو آزاد کیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کے فوت شدہ بھائی کا یہ بیٹا بڑا ہو کر نبی بنے گا اور اس کے باطل معبودوں کو جھٹلائے گا ورنہ وہ تو بھتیجے کی پیدائش کی خوشی منانے کے بجائے اس کے برعکس کوئی طرزِ عمل اختیار کرتا۔ ابولہب کے عمل سے استدلال کیسے کیا جا سکتا ہے، وہ کوئی مسلمان نہیں بلکہ نبی ﷺ کا دشمن اور بدترین کافر تھا جس کی مذمت میں قرآن نازل ہوا۔ نبی ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے تو کسی کی پیدائش کے لحاظ سے کبھی کوئی دن نہیں منایا۔ تو پھر اب سنتِ رسول اور طریقہ صحابہ کو چھوڑ کر ابولہب کا عمل کیوں اختیار کیا جا رہا ہے؟ کیسی ستم ظریفی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے اسوۂ حسنہ پر ابولہب کے اسوہ کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ رہی بات اس کے مرنے کے بعد اسے خواب میں دیکھے جانے کی تو یہ نہ تو قرآن کی آیت ہے اور نہ کوئی حدیثِ رسول ﷺ، یہ تو محض ایک خواب ہے جس کی زبانِ نبوت یا صحابہ سے کوئی تصدیق وارد نہیں۔ بھلا خواب دین میں کب حجت ہوا کرتے ہیں؟ البتہ نبی کے خواب سچے ہوتے ہیں، لیکن عام طور سے غیر نبی کے خواب عجیب و غریب ہی ہوا کرتے ہیں اور یہ خواب تو حد درجہ عجیب و غریب ہے کہ جس میں عالمِ برزخ کا عالمِ دنیا سے رابطہ ہونا بیان کیا گیا ہے اور مرنے والا عالمِ برزخ کی کیفیت بیان کر رہا ہے۔ قرآن و حدیث کی کسوٹی پر تو یہ اور اس قسم کے دوسرے خواب سراسر باطل قرار پاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو عالمِ دنیا اور عالمِ برزخ کے درمیان قیامت تک کے لئے ایک آڑ رکھی ہے۔ اللہ کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے والے شہداء باوجود شدید خواہش کے باوجود اپنا پیغام دنیا والوں تک نہ پہنچا سکے جیسا کہ احادیث میں بیان کیا گیا ہے، البتہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران کی یہ آیت نازل فرما کر دنیا والوں کو ان کے حال سے باخبر کیا:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ (آل عمران:۱۶۹)

"جو اللہ کی راہ میں قتل کئے جائیں انہیں مردہ نہ سمجھو وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں اور رزق دیے جاتے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ ایک اور شہید کی تمنا ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے:

قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۝ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝ (یٰس ۲۶-۲۷)

"کاش میری قوم کو معلوم ہو کہ میرے رب نے مجھے معاف فرمایا اور مجھے عزت والوں میں شامل کر دیا۔"

اللہ کی راہ میں جان دینے والے شہید تو خود کسی کو اپنے حال کی خبر نہ دے سکیں اور وہ اس کی تمنا ہی کرتے رہیں جبکہ اللہ کا دشمن ابولہب خواب میں لوگوں سے اپنا حال بیان کرتا پھرے، کیسی عجیب اور بے سروپا بات ہے! اب جس کا دل چاہے وہ قرآن و حدیث کو مان

لے کر ایسا ہونا ممکن ہے اور جس کا دل چاہے وہ خوابوں پر ایمان لے آئے۔

جشن میلاد برپا کرنے والوں کی اس بدعت کے جواز میں ایک اور دلیل ملاحظہ فرمایئے کہ نبی سے پیر کے دن روزہ رکھنے کے متعلق سوال کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ اسی دن اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی نازل فرمائی اور اسی دن میں پیدا ہوا۔ (صحیح مسلم کتاب الصوم) حدیث میں تو اس دن روزہ رکھنے کا ہی ذکر ہے، کوئی اور خاص کام تو ثابت نہیں۔ لیکن یہ فرماتے ہیں کہ جب نبی ﷺ نے اپنی ولادت کا دن منایا ہے تو ہم کیوں نہ منائیں؟ حالانکہ جو کچھ آج بدعات و خرافات پھیلا دی گئی ہیں ان کا کوئی اشارہ تک بھی اس حدیث میں نہیں پایا جاتا۔ اللہ کے نبی ﷺ تو پیر اور جمعرات کو روزہ رکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ ان دنوں میں اللہ کی بارگاہ میں اعمال پیش ہوتے ہیں اور میں پسند کرتا ہوں کہ جب میرے اعمال بارگاہ الٰہی میں پیش ہوں تو میں روزے سے ہوں (جامع ترمذی ابواب الصوم)۔ جشن میلاد برپا کرنے والے اگر واقعی نبی ﷺ سے محبت کرتے ہیں تو سنت پر عمل کریں کہ ہر پیر اور جمعرات کو روزہ رکھا کریں۔ نبی ﷺ کی سنت کے بجائے ہندوؤں کی جنم اشٹمی اور عیسائیوں کے کرسمس کی طرح سال میں ایک دن جلسے جلوس، ہوتے ہوئے اور لاؤڈ اسپیکروں پر دن رات شور شرابہ اور دھماچوکڑی کر کے غیر مسلموں کی تقلید کرنا آخر نبیؐ سے محبت کا کون سا انداز ہے جس پر یہ عمل پیرا ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ تو شکر گزاری کا اظہار روزہ رکھ کر کریں اور یہ نام نہاد عاشق رسول اس کے برعکس شکم بازی کریں! آج جو کچھ نبی ﷺ کی پیدائش کی خوشی میں کیا جاتا ہے وہ اسلام نہیں، نہ اللہ کے نبی ﷺ نے اس کا حکم دیا اور نہ صحابہؓ نے اللہ کے نبی ﷺ سے بہت زیادہ محبت رکھنے کے باوجود کبھی ایسا کیا۔ ایمان والوں کے لئے صحابہ کرام کا طرز عمل نمونہ ہے اور ان کا ایمان معیار۔ ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ انہوں نے یہ سب کچھ نہیں کیا۔

روز روشن کی طرح عیاں اس حقیقت سے چشم پوشی کرتے ہوئے مجوزین میلاد اپنے ہر فعل کو ثابت شدہ قرار دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ جشن میلاد کے خود ساختہ موقع پر جھنڈے لگانے تک کو ثابت شدہ امر کہا جاتا ہے اور جھنڈے لگانے والوں میں جبریل علیہ السلام کا نام بھی پیش کرتے ہیں اور ثبوت میں بجائے قرآن و صحیح حدیث کے اپنے ہی جیسے لوگوں کی کتابوں کے حوالے پیش کرتے ہیں یا پھر احادیث کے نام سے لکھی جانے والی وہ کتابیں جن میں من گھڑت اور ضعیف روایات ہی پائی جاتی ہیں، جبکہ کوئی صحیح حدیث تو ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔

اللہ کے نبی ﷺ نے دو عیدیں بتائی تھیں، عید الفطر اور عید الاضحیٰ (ابوداؤد، نسائی)۔ اللہ کے نبی کی بتائی ہوئی عیدوں کو ناکافی سمجھ کر یہ تیسری عید (عید میلاد النبی کے نام سے) ایجاد کی گئی ہے اور پھر اسے عیدوں کی عید قرار دے کر یہ شعر پڑھا جاتا ہے کہ: —

نثار تیری چہل پہل پر ہزار عیدیں ربیع الاول

جہاں میں ابلیس کے سوا سبھی تو خوشیاں منا رہے ہیں (۱)

یعنی نبی ﷺ اور صحابہؓ زندگی بھر جو دو عیدیں مناتے رہے، ایسی ہزاروں عیدیں ان کی اپنی ایجاد کردہ عید پر نثار اور قربان کی جا سکتی ہیں! غور کرنے کا مقام ہے کہ جب رسولؐ کا دم بھرنے والے نبی ﷺ کے حکم کا کیسا مذاق اڑا رہے ہیں! جب انہیں سمجھایا جاتا ہے کہ اسلام میں تو صرف دو ہی عیدیں ہیں تو بجائے اصلاح کے جہل و حجت سے کام لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام میں دو نہیں اور بھی عیدیں ہیں کیونکہ عبداللہ بن عباسؓ نے آیت تکمیل دین:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ (المائدۃ ۳)

"آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا، تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لئے دین اسلام پر راضی ہو گیا۔"

کے متعلق فرمایا کہ یہ دو عیدوں یعنی جمعہ و عرفہ والے دن نازل ہوئی (مشکوٰۃ باب الجمعہ)۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ عید صرف عید الفطر اور عید الاضحیٰ ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے لئے ہر جمعہ عید ہونے کی وجہ سے ہر ہفتے عید ہوتی ہے۔ یوم جمعہ کو بعض احادیث میں عید کہا گیا ہے (اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے) لیکن کیا نبی ﷺ کے یوم ولادت کو بھی کسی حدیث میں عید کہا گیا ہے؟ اگر نہیں اور قطعاً نہیں تو جمعہ کو عید کہنے سے یوم میلاد یوم عید کیسے ثابت ہو جائے گا؟ دعوے اور دلیل میں مطابقت تو ہونی چاہئے۔ دوسرے یہ کہ جمعہ کو عید قرار دیا گیا ہے تو اس دن غسل کرنے، خوشبو لگانے، مسواک کرنے اور نماز جمعہ ادا کرنے کا حکم ہے نہ کہ جلوس نکالنے، عمارتیں و گلیاں سجانے اور "لنگر شریف" لٹانے کا۔ پھر یہ کہ جمعہ کے دن لوگ اپنے کام کاروبار بھی کرتے ہیں۔ عیدین کی طرح نہ تو عام چھٹی ہوتی ہے اور نہ ہی اس کو بطور تہوار منایا جاتا ہے۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ احادیث میں جمعہ کو عید حکماً کہا گیا ہے ورنہ جمعہ عید الفطر و عید الاضحیٰ کی طرح حقیقتاً عید نہیں ہے۔ جس طرح اللہ کی راہ میں قتل ہونے والا تو حقیقی شہید ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی نبی ﷺ نے کئی افراد کو شہید قرار دیا ہے، مثلاً ڈوب کر مرنے والا، طاعون سے مرنے والا وغیرہ۔ جیسا کہ احادیث میں موجود ہے، یہ سب شہداء حکماً شہید ہیں یعنی اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے انہیں بھی شہادت کے اجر و ثواب سے نواز دے گا، لیکن جو اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جائے وہ قیامت سے پہلے براہ راست جنت میں پہنچ جاتا ہے۔ ان شہداء کا یہ معاملہ نہیں۔ اسی طرح سے یوم جمعہ کو حکماً عید کہا گیا ہے کہ یہ مسلمانوں کے لئے خصوصی عبادت کا دن ہے۔ عرفہ کا دن بھی خصوصی عبادت کے حوالے سے حکماً عید ہے۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ اگر یوم جمعہ حقیقی عید ہوتا تو اس دن روزہ رکھنا قطعاً ناجائز ہوتا کیونکہ عید کے دن روزہ رکھنے کی احادیث میں واضح ممانعت وارد ہے جبکہ اگر کوئی مسلمان ہر مہینے کچھ روزے مثلاً ایام بیض وغیرہ کے رکھتا ہے اور ان میں جمعہ بھی آ جاتا ہے تو وہ جمعہ کو بھی روزہ رکھ سکتا ہے۔ پھر یہ کہ اگر نبی ﷺ کا یوم ولادت بھی عیدین کی طرح یوم عید ہوتا تو اس دن بھی روزہ رکھنا جائز نہ ہوتا حالانکہ نبی ﷺ خود پیر کے دن روزہ رکھا کرتے تھے جو نبی ﷺ کی پیدائش کا دن تھا۔ صحابہؓ نے نبی ﷺ کی پیدائش کے دن کبھی جشن میلاد برپا نہیں کیا، نہ اس دن جلوس نکالے، نہ کبھی سال اس دن کے حوالے سے مردانہ و زنانہ محافل میلاد و نعت منعقد کیں۔ انہوں نے نبی ﷺ سے محبت کا اظہار آپ کی کامل اطاعت کر کے کیا اور یہی سچی محبت ہے۔ صحابہؓ نے تو اس دن کی اتنی اہمیت بھی نہ سمجھی کہ اس دن سے اسلامی کیلنڈر کا آغاز کرتے بلکہ انہوں نے تو اسلام کے لئے اپنے گھر بار چھوڑ کر مدینے ہجرت کرنے کے دن سے اسلامی سن کا آغاز کیا۔ اسی لئے مسلمانوں کا سن "سن ہجری" کہلاتا ہے۔

باقی صفحہ 39 پر

(۱) حالانکہ ابلیس تو نہیں دیکھ کر سب سے زیادہ خوش ہوتا ہو گا کہ رسولؐ سے محبت کا دعویٰ کرنے والے ان کی سنت پر عمل کرنے کے بجائے میرے طریقے پر چل رہے ہیں!

قافلہ ہے رواں دواں

رپورٹ : کیپٹن (ر) ارشد

سالانہ کل پاکستان تربیتی اجتماع طلبہ ناظمین

طلبہ ناظمین کا اجتماع مورخہ ۴ راپریل ۱۹۹۹ء مسجد توحید، رفاہ عام سوسائٹی، کراچی میں منعقد ہوا۔ صلوٰۃ الفجر کے بعد آزاد کشمیر کے طلبہ ناظم الطاف حسین صاحب نے درس قرآن وحدیث دیا۔ سورۃ العنکبوت کی ابتدائی آیات ان کی تقریر کا موضوع تھیں۔ ان کے بیان کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ ایمان قبول کرنے کے بعد یونہی نہیں چھوڑ دیا جائے گا بلکہ آزمائش کی بھٹی میں تپایا جائے گا تاکہ کھوٹے اور کھرے ایمان کی پہچان ہو۔ پہلے بھی ایمان کی دعوت اٹھانے والوں کے ساتھ یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ اب بھی جو لوگ شرک سے بھرے ماحول میں ایمان کی دعوت لے کر کھڑے ہوئے ہیں انہیں آزمائشوں سے گھبرانا نہیں ہے بلکہ ثابت قدمی واستقلال سے جمے رہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ صبر وہمت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ وقفہ برائے صلوٰۃ الاشراق وناشتے کے بعد حلقہ طلبہ ونوجوانان پاکستان کے ناظم کیپٹن (ر) ارشد صاحب کے ابتدائی کلمات سے پروگرام کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ انہوں نے سورۃ یونس کی آیت ۶۲: الآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کے حوالے سے بتایا کہ اولیاء اللہ سچے ایمان والے اور اللہ سے ڈرنے والے مومن ہوا کرتے ہیں۔ آج اپنے زعم میں جنہیں اولیاء اللہ سمجھا جاتا ہے انہیں داتا، دستگیر وغیرہ کے القاب دے گئے ہیں جو کہ کھلا شرک ہے۔

اس کے بعد کراچی کے طلبہ ناظم خالد عزیز صاحب نے اصول تجوید وقرأت قرآن کی مشق کرائی۔ اس پروگرام سے ساتھیوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اگلا پروگرام حبل اللہ ۱۸ اور ۱۹ کے حوالے سے کوئز پروگرام تھا جو کہ سرگودھا کے سجاد حسین اور کراچی کے سلمان عبداللہ وغلام اللہ صاحبان نے کیا۔ سخت مقابلے کے بعد کراچی کے ساتھی طارق محمود، یونس چھاچھی اور ڈاکٹر ارشد بالترتیب اول، دوم اور سوم قرار دیے گئے۔ اس کے بعد فہم القرآن کا پروگرام تھا جس کا عنوان سورۃ المائدۃ کی آیت ۵۴: وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ تھا۔ اس موضوع پر چار تقریریں ہوئیں۔ مقررین نے بتایا کہ اللہ کی رضا کے لئے ایمان قبول کرنے کے بعد ایمان کے دعویدار کے انداز میں تبدیلی آنی چاہئے، کوئی ناراض ہو، برا بھلا کہے یا لعن طعن کرے ہمیں ان سب باتوں کی پرواہ کئے بغیر اپنے مالک کو راضی کرنا ہے۔ اللہ کے ساتھ ساتھ لوگوں کی ناراضگی کا بھی خیال رکھا گیا تو یہ منافقت ہوگی۔ اللہ ہمیں منافقت سے بچائے۔ طعام وصلوٰۃ الظہر کے بعد تعارف وتجاویز کا پروگرام تھا اور پھر لاہور کے ساتھی معراج الدین صاحب نے تقریر کی جس کا عنوان سورۃ النساء کی آیت: "اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اطاعت کرو اور ان کی جو تم میں صاحب امر ہوں۔" تھی جس میں انہوں نے بتایا کہ ایمان پر مبنی اجتماعیت میں سمع وطاعت کی بہت زیادہ اہمیت ہے اور اس کے بغیر اجتماعیت بے معنی ہے۔ اللہ کے نبی نے بھی متعدد احادیث میں سمع وطاعت پر زور دیا ہے۔ وقفہ برائے چائے وصلوٰۃ العصر کے بعد محمدی گل صاحب نے اختتامی تقریر کی جس کا موضوع سورۃ یونس کی آیت ۸۳ تھی کہ: "فرعون اور اس کے درباریوں کے خوف سے کہ وہ انہیں فتنے میں نہ ڈال دیں، موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ ان کی قوم کے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ دیا۔" محمدی گل صاحب نے بتایا کہ حق کا ساتھ دینا اور طاغوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا جواں مردوں کا کام ہے۔ ایسے ہی چند نوجوان اصحاب کہف تھے۔ ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنی قوم کے بتوں کو توڑ ڈالا تو قوم والوں نے یہی کہا کہ ایک جوان جسے ابراہیم کہا جاتا ہے وہی ان باباؤں کے خلاف زبان کھولتا تھا، یہ اسی کا کام ہو سکتا ہے۔ سچے ایمان کی دعوت کو لے کر جوان ہی اٹھتے رہے ہیں اور اس راہ میں قربانیاں دیتے رہے ہیں۔ لیکن اس قوم کی بدقسمتی کہ اس کے جوان گلوکار، اداکار اور کرکٹر بننا پسند کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں سمجھ دے۔ محمدی گل صاحب کی تقریر کے ساتھ یہ تربیتی پروگرام اختتام کو پہنچا۔

سالانہ کل پاکستان اجتماع ناظمین

اجتماع ناظمین مسجد توحید، رفاہ عام سوسائٹی، کراچی میں ۵ اور ۶ راپریل ۱۹۹۹ء کو منعقد ہوا۔ بعد صلوٰۃ الفجر پنجاب کے امیر حکیم محمد رمضان صاحب نے درس قرآن وحدیث دیا جس میں انہوں نے بتایا کہ انسان اور جن کی تخلیق کا مقصد اللہ واحد کی بندگی ہے مگر انسانیت اللہ کے ساتھ شرک کر کے شیطان کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہے، جس کی بنا پر ہر جگہ اللہ کا عذاب مختلف شکلوں میں اس پر مسلط ہے اور اس سے بچاؤ کی صرف یہی صورت ہے کہ شرک سے پاک ایمان اختیار کر کے اللہ کی خالص بندگی کی جائے۔

صلوٰۃ الاشراق اور ناشتے کے بعد آزاد کشمیر کے امیر محمد آزاد خان صاحب نے سورۃ الزمر کے حوالے سے افتتاحی کلمات کہے۔ ان کے بیان کی مرکزی بات یہ تھی کہ قرآن وحدیث کی خالص دعوت دینے والے ہی معاشرے میں انقلاب لاتے ہیں مگر پہلے ان کی اپنی زندگی میں انقلاب آتا ہے۔ کتنے ہی قرآن کو دریں انقلاب دینے والی کتاب کہنے والے ہیں مگر معاشرے کے دباؤ اور حالات سے شکست کھا کر قرآن وحدیث کی بنیادی دعوت یعنی کفر بالطاغوت کے بعد ایمان باللہ کی بات سے ہٹ چکے ہیں اور دنیا ان پر چھا چکی ہے اور دینداری دکانداری بن گئی ہے۔ ہمیں صرف آخرت کو سامنے رکھتے ہوئے ایمان خالص کی دعوت کو لے کر چلنا ہے۔

اس کے بعد فہم القرآن کا پروگرام تھا۔ مختصر دورانیے کی ان تقاریر کا موضوع وفات النبی ﷺ تھا کیونکہ قبر پرستی کے شرک کو بنیادی حیات النبیؐ کے عقیدے سے ملی ہے۔ اس موضوع پر تقاریر صوبہ سرحد کے ڈاکٹر تحسین، آزاد کشمیر کے محمد افضل بٹ اور میرپور خاص سندھ کے محمد اسلم صاحبان نے کیں جس میں انہوں نے بیان کیا کہ آج نبی ﷺ کے لئے وفات یا موت کے لفظ کا استعمال ہی گستاخی سمجھا جانے لگا ہے حالانکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے دوسرے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ساتھ محمد ﷺ کے لئے بھی موت کا لفظ استعمال کیا ہے، لہٰذا اس میں کوئی گستاخی نہیں، گستاخی تو یہ ہے کہ انہیں زندہ مان کر اللہ کی صفت "حی" میں شریک کیا جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور شہداء قبروں میں نہیں بلکہ جنتوں میں زندہ ہیں۔ بعض ہوشیار قسم کے لوگ کہتے ہیں کہ یہ عقیدے کا مسئلہ نہیں، حالانکہ یہ سراسر عقیدے کا مسئلہ ہے اسی لئے تو قرآن میں اس کا ذکر ہے، احادیث میں اس کا بیان ہے۔ نبی ﷺ کی وفات کے بعد حیات کا ذکر کسی قرآنی آیت اور صحیح حدیث میں نہیں ملتا بلکہ نبی ﷺ کی وفات کے بعد ابوبکرؓ نے جو خطبہ دیا جس میں قرآن کی آیات کے حوالے سے واضح کر دیا کہ نبی ﷺ کو موت آچکی ہے، اب ان کو زندہ ماننے والا اللہ کے بجائے نبی ﷺ کی عبادت کرنے والا سمجھا جائے گا۔ اس پر کسی صحابی نے اعتراض نہیں کیا اور وفات النبی پر صحابہؓ کا اجماع ہو گیا۔

کھانے اور صلوٰۃ الظہر کے بعد کراچی کے ساتھی منور سلطان نے عربی زبان اور اس کی گرامر کو سیکھنے کی اہمیت و ضرورت بیان کرتے ہوئے ساتھیوں کو اسمائے ضمائر بتائے اور حاضرین سے ان کی مشق بھی کروائی۔ اس کے بعد کراچی ہی کے دوسرے ساتھی سعید احمد صاحب نے فتنہ انکار حدیث پر تقریر کی اور بتایا کہ صحیح احادیث کا انکار قرآن کا انکار ہے۔ منکرین حدیث کہا جانے والا گروہ دراصل منکر قرآن ہے کیونکہ صحیح احادیث قرآن کی معنوی تحریف کا راستہ روکتی ہیں۔ احادیث کے انکار کے بعد یہ لوگ مغرب سے مرعوب ہو کر قرآن کو اپنے ذہن کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے چند مثالیں بھی بیان کیں۔ اس کے بعد باہمی مشاورت کا پروگرام تھا جس میں ساتھیوں نے اس اجتماع اور دعوتی کام کے سلسلے میں اپنی تجاویز اور مشورے دیئے۔ اس حوالے سے جو سوالات ہوئے امیر تنظیم نے قرآن وحدیث کے حوالے سے ان کی مدلل وضاحت کی اور دعوت الی اللہ کے کام کے لئے قرآن وحدیث کی روشنی میں لائحہ عمل بھی بیان کیا۔

صلوٰۃ المغرب کے بعد ڈاکٹر عمر خطاب صاحب کی صحابہ کرامؓ کے ایمان کے حوالے سے تقریر تھی۔ انہوں نے بتایا کہ موجودہ تمام مسالک آج اس ایمان سے ہٹ چکے ہیں جو ابوبکر، عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم اجمعین کا تھا جبکہ اللہ تعالیٰ سورۃ البقرۃ آیت ۱۳۷ میں بیان فرماتا ہے کہ اگر ہدایت پر آنا ہے تو صحابہ کرامؓ جیسا ایمان لانا ہو گا۔ صحابہ کرامؓ میں ہمیں یہ تیجے، چالیسویں، عرس، میلے، تصوف وغیرہ ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے جو آج رائج ہیں۔

۱۶ اپریل کی صلوٰۃ الفجر کے بعد محمد ی گل صاحب کا خطاب تھا۔ انہوں نے بیان کیا کہ آج جس طرح مختلف مسالک کے بڑوں نے قرآن وحدیث کا راستہ روکنے کیلئے اپنے پیروکاروں کے لئے نصاب اور کتابیں لکھی ہیں جو انہی کو دن رات پڑھتے اور سناتے ہیں، اسی طرح نبی ﷺ کے دور کے ایک شخص نضر بن حارث کا حال تھا کہ جہاں نبی ﷺ نے اپنی دعوت شروع کی وہاں یہ رستم و سہراب کی داستانوں کی کتاب کھول کر جھوٹے واقعات سنانا شروع کر دیتا تھا۔ آج نضر بن حارث کے راستے پر چلنے والوں کا ہمیں بھی سامنا ہے۔ انشاءاللہ یہ ناکام ہوں گے اور خالص ایمان کی دعوت آگے بڑھے گی۔

ناشتے اور صلوٰۃ الاشراق کے بعد اصول تجوید و قرات القرآن کا پروگرام تھا جو کہ راولپنڈی کے ساتھی خلیل الرحمٰن صاحب نے کیا اور ساتھیوں کو تجوید کی اہمیت اور تجوید سے قرآن پڑھنے کے اصول بتا کر ان کی مشق کروائی۔ اگلا پروگرام اصول حدیث کا تھا۔ کراچی کے ساتھی یعقوب علی صاحب نے فن حدیث کے تعارف اور اصطلاحات حدیث کی وضاحت کی۔ اس کے بعد کیر والا خانیوال کے ناظم ماسٹر سرفراز صاحب نے "کل حزب بما لدیھم فرحون" کے حوالے سے تقریر کی اور بتایا کہ آج اسلام کی مرکزی بات یعنی توحید کو چھوڑ کر یہ مختلف مسالک اپنے چند امتیازی مسائل کے پیچھے جھگڑ رہے ہیں جبکہ دین اسلام میں مسلک و فرقہ بندی کا جواز نہیں بلکہ قرآن میں اسے شرک قرار دیا گیا ہے۔

صلوٰۃ الظہر کے بعد سرگودھا کے ناظم ماسٹر عبدالعزیز صاحب نے قرآن وحدیث کے علم کے لئے عربی زبان سیکھنے کی اہمیت بیان کرنے کے بعد عربی گرامر کے چند اسباق سمجھائے اور ماضی و مضارع کی گردانوں کی مشق کرائی۔ اس کے بعد امیر تنظیم کے اختتامی کلمات تھے جس میں انہوں نے موجودہ دور میں اہل ایمان کی ذمہ داریوں کا احساس دلانے کے ساتھ یہ بتایا کہ اس اجتماع سے جانے کے بعد ہمیں آرام سے نہیں بیٹھنا ہے بلکہ اپنے اپنے حلقوں میں ساتھیوں کی تربیت کرنی ہے تاکہ یہ اجتماعیت جو صرف اللہ کے دین کو باطل ادیان پر غالب کرنے کے لئے قائم ہوئی ہے، اپنے مقصد کو پورا کر سکے۔ اپنی کمزوریوں اور خامیوں کو دور کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے صلوٰۃ اور دعاؤں کے ذریعے اپنے تعلق کو مضبوط کرنا ہے اور اس راستے میں لگے رہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ توفیق دے۔ آمین۔ امیر تنظیم کے اختتامی خطاب کے ساتھ یہ اجتماع ختم ہوا۔

سلسلہ سوال و جواب

ڈاکٹر مسعود الدین عثمانیؒ
ترتیب : غلام اللہ

سوال ۱: روحوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سب ایک دن پیدا ہوئی ہیں۔ اللہ نے ان سب سے اقرار لیا تھا۔ وضاحت کریں کہ تخلیق کے بعد اور پیدائش سے قبل روحوں کا قیام کہاں ہوتا ہے؟

جواب: اللہ نے روح سے متعلق تفصیل میں جانے سے منع فرمایا ہے کہ تم نہیں جان سکتے:

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ؀ (بنی اسرائیل:۸۵)

"اور (اے نبیؐ) یہ آپ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ روح تو میرے رب کے حکم سے ہے، اور تم لوگوں کو اس کے بارے میں بہت کم علم دیا گیا ہے۔"

اللہ ہی کو اس کا مکمل اور صحیح علم ہے۔ حدیث میں یہ آتا ہے کہ انہیں یوم الست میں نکالا۔ یہ نہیں آتا کہ سب ایک ساتھ ہی بنی تھیں۔ اور یہ کب بنی تھیں، قرآن و حدیث میں اس کی کوئی وضاحت نہیں۔ اس بارے میں جو حدیث بیان کی جاتی ہے وہ ابی ابن کعبؓ کی ترمذی وغیرہ کی روایت ہے۔ بخاری و مسلم میں یہ حدیث نہیں ہے۔ اور اس روایت میں ہے کہ اللہ نے انسانی روحوں کو جسم دیا، چھوٹا سا جیسے چیونٹی کا جسم ہو اور ان کو جمع کرنے کے بعد ان سے یہ سوال کیا کہ: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ (الاعراف:۱۷۲) "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" سب نے کہا: بَلٰى شَهِدْنَا "کیوں نہیں۔ ہم گواہی دیتے ہیں۔" اس آیت میں مالک آگے فرماتا ہے کہ ہم نے یہ عہد اس کے دنیا میں آنے سے پہلے اس لئے لیا کہ اگر یہ انسان دنیا میں آکر یہاں شرک کرے اور یوں شرک کر کے ہم کو گالی دے اور قیامت کے دن جب ہمارے پاس آئے اور ہم اس سے پوچھیں کہ تو نے شرک کیا ہمیں گالی دی، تو یہ انسان کہیں یہ جواب نہ دے کہ مالک ہمیں تو شرک اور توحید کا پتہ ہی نہ تھا، ہمیں کیا معلوم، ہم کو توحید کی خبر ہی نہ تھی، ہمارے بڑے بوڑھے جو ہمارے بزرگوں کو دیکھتے آئے تھے وہ جو کرتے تھے ہم نے سمجھا کہ یہی حق ہے، تو ہم یہ سب کچھ کرتے رہے، تو مالک ہمیں کیوں پکڑتا ہے، ان کو پکڑ جنہوں نے اس کو شروع کیا تھا۔ مالک فرماتا ہے کہ ہم نے دنیا میں بھیجے جانے سے پہلے ان سے یہ عہد لیا کہ ان کا یہ عذر ختم ہو جائے۔ بس اتنی بات ہے جو قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ اتنا جاننا اور بیان کرنا ہی صحیح ہے۔ اور اس سے زیادہ کی کھوج میں پڑنا دل کی بیماری کا سبب ہے۔

سوال ۲: جس مسجد میں یا محمد نہ لکھا ہو یا جہاں کا امام تنخواہ نہ لیتا ہو تو کیا وہاں جماعت سے نماز پڑھ سکتے ہیں؟

جواب: جماعت کی نماز وہاں ہوتی ہے جہاں صحیح العقیدہ امام ہو اور اس کے پیچھے بھی ایسے لوگ ہوں جن کے عقائد کے اندر کوئی خرابی نہ ہو۔ ایسے ہی لوگوں کے مل کر صلوٰۃ ادا کرنے کو صحیح معنوں میں مومنوں کی جماعت کہا جا سکتا ہے۔ ایسی ہی جماعت کے لئے اللہ کا حکم ہے کہ: وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (البقرۃ:۴۳) "رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔" اور جہاں ایسا امام ہو جس کے عقائد میں کفر و شرک شامل ہو اور اس کے پیچھے بھی ایسا ہی ایمان رکھنے والے کھڑے ہوں تو ان کی جماعت کوئی جماعت نہیں۔ اور آج آپ خود دیکھ سکتے ہیں۔ کسی بھی امام سے جا کر چپکے سے پوچھ دیکھیں کہ مولوی صاحب آج کل ایک گروہ اٹھا ہے جو کہتا ہے کہ نبی ﷺ اپنی مدینے والی قبر میں زندہ نہیں بلکہ وفات پا چکے ہیں۔ تو وہ فوراً جامے سے باہر ہو جائے گا۔ اور اگر آپ اس سے یہ بھی پوچھ لیں کہ کیا درود و سلام کے اعمال نبی ﷺ پر پیش ہوتے ہیں یا اللہ پر کیونکہ ہم درود و سلام میں اللہ سے نبی ﷺ کے لئے رحمت کی دعا کرتے ہیں تو یہ دعا اللہ کے پاس جانی چاہئے جب کہ آپ کا عقیدہ ہے کہ فرشتے درود و سلام نبی ﷺ پر پیش کرتے ہیں تو کیا فرشتے بھول کر یہ درود نبی ﷺ کے سامنے لے جاتے ہیں؟ تو وہ اور زیادہ بپھر جائے گا۔ ہمارے ساتھی نے ایک مفتی سے یہی سوال کیا تھا کہ محترم ہم تو کہتے ہیں کہ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ: اے اللہ رحمت فرما محمدؐ پر۔ ہم تو یہ دعا اللہ سے کرتے ہیں اور آج دنیا والے کہتے ہیں کہ فرشتے اسے لے جا کر نبی ﷺ کی قبر پر پیش کر دیتے ہیں۔ تو کیا فرشتے عربی بھی نہیں جانتے اور یہ نہیں سمجھتے کہ کس کو خطاب کیا ہے؟ مفتی صاحب نے اسے جائے جواب دینے کے تھپڑ رسید کر دیا تو یہ مسئلہ ہے۔ اس امت کے سارے مسالک کا یہی عقیدہ ہے۔ اور ہر جگہ یہی معاملہ ہے۔ تو چاہے مسجد میں یا محمد نہ لکھا ہو، چاہے وہاں امامت کرانے والا تنخواہ نہ لیتا ہو، مگر ان لوگوں کے عقیدے میں کفر و شرک پایا جاتا ہے۔ ان کے پیچھے ان کی امامت میں نماز جائز نہیں۔ یہ ہیں اس امت کے پیشوا لوگ ان پر دولت نچھاور کرتے ہیں۔ ان کی پالکی کے لئے آتے ہیں۔ ان کے پیروں کے دھوون پیتے ہیں۔ ان سے ہاتھ ملانا باعث سعادت سمجھتے ہیں۔ ان کا ایمان خالص نہیں۔ ان کی کوئی نماز نہیں۔ اللہ فرماتا ہے: وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ یعنی "رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔" اور رکوع ان جو خالص ایمان

کے حاملین پر فرض نہیں ہے۔ یہ لوگ صحیح مومن نہیں جبکہ نماز کے لئے تو مالک فرماتا ہے: اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (النساء ۱۰۳) دیکھو ہم نے نماز ان پر فرض نہیں کی، صرف مومنوں پر فرض کی ہے۔ جس کا ایمان درست نہیں اس پر نہ نماز فرض ہے نہ روزہ نہ حج نہ زکوٰۃ۔ لہٰذا جو مومن ان کے پیچھے نماز پڑھتا ہے وہ اپنی نماز ضائع کر کے ایک طرح سے اللہ کے وقار کو للکارتا ہے کہ دیکھ لے مالک! میں تیری کچھ پرواہ نہیں کرتا، کفریہ شرکیہ عقیدہ رکھنے والے کو امام بنا سکتا ہوں۔ ان لوگوں کو اللہ کے یہاں جانے کے بعد پتہ لگ جائے گا۔ صحیح مومن تو ان سے قطعی لاتعلق رہتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ مالک میں جماعت چاہتا ہوں، مگر ان مسجدوں میں نہیں جاؤں گا جہاں غیر اللہ کو پکارا جاتا ہے، قرآن و حدیث کے خلاف عقائد رکھنے والوں کے پیچھے نہیں کھڑا ہوں گا۔ اور وہ کوشش کر کے اپنے ساتھیوں میں پہنچتا ہے کہ کہیں مومنوں کی جماعت مل جائے۔ یا پھر مجبوراً اپنے گھر میں پڑھتا ہے، دکان پر پڑھتا ہے، بازار میں پڑھتا ہے۔ اور اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی مسجد بن جائے جہاں اللہ کے خالص بندے جمع ہو سکیں تاکہ جماعت کا ثواب ستائیس گنا ملے۔ اور جب تک یہ موقع میسر نہیں ہوتا وہ اللہ سے دعا گو رہتا ہے کہ مالک! تیرے وقار کو نہیں للکاروں گا، مر جاؤں گا مگر کفریہ شرکیہ عقائد رکھنے والوں کے پیچھے نماز نہیں پڑھوں گا۔ تو وہ غفور مالک اگر چاہے گا تو اپنے اس غیرت مند بندے کے خلوص پر پچیس تو کیا پچیس ہزار گنا ثواب دے گا۔ جماعت کے ثواب سے بھی زیادہ۔ اور قیامت کے دن مالک میدان حشر میں لوگوں سے کہے گا کہ یہ دیکھو یہ آ رہا ہے، میرا یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے تھا، دنیا میں اس نے صرف میری بندگی کی، صرف توحید کا ساتھ دیا، کفر و شرک سے آلودہ عقائد رکھنے والوں کا دشمن تھا اور صرف میرے وقار کے لئے پوری دنیا سے لڑائی مول لئے ہوئے تھا۔ لہٰذا اگر آپ ایمان دار ہیں تو ان بے ایمانوں کے پیچھے نماز نہیں پڑھ سکتے۔ اور اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ میں عالم نہیں ہوں کہ ہر امام کے عقیدے کی تحقیق کر سکوں، تو یہ بھی کوئی دلیل نہیں۔ ہم نے اپنے کتابچوں میں آج دنیا میں جتنے بھی مسالک پائے جاتے ہیں، سب کے مشرکانہ عقائد واضح کر دئے ہیں۔ اہلحدیث، حنابلہ، اور سعودی عرب کے محمد بن عبدالوہاب کا بھی اور اس کے بیٹے کا بھی۔ ان کا بھی یہی مشرکانہ عقیدہ ہے۔

سوال ۳: اشاعت التوحید والسنۃ کے غلام اللہ خان کے عقائد کے متعلق بتایئے۔

جواب: غلام اللہ خان اپنی تفسیر "جواہر القرآن" میں سماع موتیٰ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ عام طور پر تو یہ اتفاقی مسئلہ ہے۔ لیکن بزرگوں نے بتایا ہے کہ نبی علیہ السلام سے ملاقات بھی ہوئی ہے اور بات بھی، تو یہ عالم مثال کا معاملہ ہے۔ اور اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ نبی علیہ السلام پر درود نہیں پیش کیا جاتا، فرشتے نہیں پیش کرتے تو یہ حق ہے۔ یعنی نبی ﷺ پر اعمال پیش ہونے کو ہم مانتے ہیں اور جو نہیں مانتا وہ بھی حق ہے۔ یعنی نبی ﷺ پر درود و اعمال پیش ہونے کا عقیدہ حق ہے۔ اسی طرح یہ لکھتے ہیں کہ دعا میں بحق فلاں کہنا تو جائز نہیں، لیکن بحرمت فلاں کہنا جائز ہے۔ اور آخری دور میں تو وہ کہنے لگے تھے کہ یہ حیات فی القبر اور سماع موتیٰ کا مسئلہ فروعی مسئلہ ہے۔ حالانکہ اس مسئلے کو بھی خود انہوں نے اٹھایا تھا دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر۔ مگر آخر میں ان کا حال یہ ہو گیا کہ کہتے تھے جو اس کو نہ مانے کہ نبی ﷺ پر اعمال پیش ہوتے ہیں تو وہ بھی حق ہے، اور دعا میں بحرمت فلاں کہنا جائز ہے ...... اس پر کوئی اعتراض نہیں ...... حالانکہ یہ ذات کا وسیلہ سب سے بڑا شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ: وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ (الاعراف ۱۸۰) کہ اگر تم اللہ کو کوئی صدقہ اور وسیلہ پیش کرنا چاہتے ہو تو اللہ کے بہترین نام ہیں اس کی ذات اور صفات کے ان کو پیش کرو، اور ملحد نہ بنو کہ اللہ کے ناموں کے مقابلے میں اس کے کسی بندے کے نام، اس کی ذات و صفات کو پیش کرنے لگو۔ مگر یہ اس شرک کے بھی جواز کے قائل ہیں۔ نیز اللہ فرماتا ہے کہ بندوں کے بندے کے سارے اعمال صرف اللہ کی طرف پلٹائے جاتے ہیں۔ اور مسلم کی حدیث میں نبی ﷺ نے بھی وضاحت فرما دی کہ تمام انسانوں کے اعمال پیر اور جمعرات کے دن اللہ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن آج پوری امت کا عقیدہ اس کے برعکس ہو گیا ہے۔ میرے علم کے مطابق آج دنیا کا کوئی عالم ایسا نہیں ہے جو یہ عقیدہ نہ رکھتا ہو، چاہے وہ محمد بن عبدالوہاب کیوں نہ ہو۔ وہ بھی اپنی کتاب التوحید میں لکھ گیا ہے کہ دنیا میں نبی ﷺ پر امت کے درود و سلام پیش کئے جاتے ہیں۔ اور یہ عبداللہ بن باز (مفتی اعظم سعودی عرب) ان کے پوتے کی شرح پر جہاں یہ بات آئی ہے اس پر حاشیہ لکھتے ہیں کہ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ درود و سلام کے اعمال نبی علیہ السلام پر پیش ہوتے ہیں، باقی جو لوگ یہ مانتے ہیں کہ امت کے تمام اعمال نبی علیہ السلام پر پیش ہوتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔ اور یہاں جو مفتی ولی حسن ٹونکی صاحب نے اپنے اس فتوے میں جس میں داڑھی منڈانے سے لوگوں کو منع کیا ہے سب کچھ لکھنے کے بعد کہتے ہیں کہ داڑھی منڈانے والو! ذرا اس پر بھی غور کرو کہ فرشتے امت کے اعمال روزانہ نبی علیہ السلام پر لے جا کر پیش کرتے ہیں، تو جب تمہارے یہ اعمال ان کے سامنے پیش ہوں گے تو انہیں کتنا دکھ ہوگا۔ تو یہ کیسا شرکیہ عقیدہ ہے کہ سارے اعمال نبی علیہ السلام پر پیش کر دئے، اور ان کے دیوبندی مسلک کی جتنی مشہور مساجد ہیں، سب کے اندر یہ لگا دیا ہے۔

سوال ۴: سوادِ اعظم میں کون لوگ شامل ہیں؟

جواب: سوادِ اعظم سے وہ لوگ مراد ہیں جو خالص مومن ہوں، توحید پر قائم اور شرک کے دشمن ہوں، وہ سوادِ اعظم ہیں، چاہے ان کی تعداد چند سو سے بھی آگے نہ ہو۔ اور جن کا ایمان صحیح نہیں وہ کفار کے سوادِ اعظم تو ہو سکتے ہیں مگر ایمان والوں کے نہیں۔

سوال ۵: بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ ہر وقت صرف ایمان اور توحید کی ہی بات کرتے ہیں، یہی ایک موضوع ہوتا ہے۔ کچھ اور بھی ہونا چاہئے۔

جواب: توحید اور ایمان نہیں تو پھر کیا میں بے ایمانی کی بات کروں۔ توحید، سنت اور آخرت، یہ بڑی بڑی باتیں ہیں۔ ان کو چھوڑ کر آخر کیا رہ جاتا ہے؟ اگر لوگوں میں توحید آ جائے اور یہ شرک چھوڑ دیں، یعنی ان کا ایمان درست ہو جائے اور عقیدہ بھی قرآن و سنت کے مطابق ہو جائے، اور ان کے اعمال، عبادات اور معاملات، دنیا کے بجائے آخرت کو نگاہ میں رکھے ہوئے ہوں، تو اس کے بعد اور کیا چاہئے۔ کیونکہ ہمیشہ سے یہی طریقہ رہا ہے۔ آپ دیکھیں کہ ہمیشہ جو بھی پیغمبر آیا ہے، کیا اس نے آکر نماز کی تبلیغ کی ہے؟ سب سے پہلے ہر نبی نے یہی بات اٹھائی ہے۔ ایمان کی بات، آخرت کا بلاوا، توحید کا جوہری مسئلہ۔ اس کے بعد موقع آتا ہے اعمال کا۔ ہم یہاں کس کو نماز پڑھوائیں؟ کس سے روزے رکھوائیں؟ یہاں تو ایمان ہی نہیں ہے۔ پہلے ایمان تو ہو۔

آپ دیکھیں، نوح علیہ السلام نے نوسو پچاس سال تبلیغ کی ہے۔ کیا ہے کہیں اس میں نماز کا کوئی ذکر؟ صرف خالص اللہ کی بندگی کی دعوت ہے۔ نماز کا کہیں ذکر تک نہیں۔ تو آج اس امت کے اندر مسئلہ یہ نہیں، اصل مسئلہ یہ ایمان کا مسئلہ ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا موقع بھی آتا ہے کہ ایمان کے ساتھ ساتھ اعمال کی تلقین بھی ہو جیسے قرآن میں بھی ہے۔ لہٰذا ہم بھی کرتے ہیں۔

سوال ۶: کیا قبر پر نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے؟

جواب: ہرگز نہیں۔ یہ صرف نبی ﷺ کی خصوصیت تھی کہ وہ مرد یا وہ خاتون جو مسجد نبوی کی خدمت کرتے تھے اور ان کی وفات پر نبی ﷺ کو صحابہ نے اس لئے خبر دار نہیں کیا کہ رات کا وقت ہے۔ تو آپؐ کو یہ خیال ہوا کہ ان لوگوں نے شاید اس کی غربت کی وجہ سے اس کو حقیر جانا اور مجھے خبر نہیں کی۔ تو آپؐ نے ان کے اس خیال کو غلط ثابت کرنے کے لئے فرمایا کہ مجھے لے چلو جہاں وہ دفن کیا گیا ہے۔ تو وہاں پہنچ کر آپؐ نے ان کی نماز پڑھی۔ حالانکہ آپ ﷺ نے واضح طور پر فرمایا ہے کہ قبرستان میں نماز نہیں ہوتی۔ مگر یہ معاملہ بالکل مختلف ہے۔ اور یہ آپ کی خصوصیت ہے کہ اس میں یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ اللہ کا کوئی غریب بندہ ہے، مگر حال اس کا یہ ہے کہ اس پریشان حالی میں بھی وہ مسجد کی صفائی کرتا تھا، خدمت کرتا تھا، تو غریب سہی، مگر اللہ کے یہاں اس کی قیمت اور اس کا مقام ہے، لہٰذا اس کو حقیر نہ سمجھا جائے۔ یہ ایک خاص واقعہ ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ایسا کیا ہے۔ یہ سب کے لئے نہیں ہے۔

سوال ۷: نبی ﷺ کا کیا مقام ہے؟

جواب: اللہ کے بندوں میں سب سے بڑھ کر ہے۔ مگر جو یہ کہتے ہیں کہ "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" تو یہ خالص کفر ہے۔ دو ایک جیسی چیزوں میں مقابلہ و موازنہ ہوتا ہے جیسے میری ٹوپی آپ کی ٹوپی سے اچھی ہے، میرا گھوڑا آپ کے گھوڑے سے اچھا ہے۔ .... اب یہ تو کوئی نہیں کہتا کہ میری سائیکل آپ کی موٹر سے اچھی ہے۔ لیکن ان ظالموں نے اللہ اور رسول میں مقابلہ کر دیا۔ یہ خالص کافرانہ بات ہے۔ وہ اللہ کی ذات! بندوں سے کیا مقابلہ! بات پوری کہو کہ اللہ کے رسولؐ بندوں میں سب سے بڑھ کر ہیں۔

بقیہ عید میلاد النبی ﷺ

ان معروضات سے کسی کی دل آزاری مقصود نہیں بلکہ صرف اور صرف یہ واضح کرنا ہے کہ ہم نبی ﷺ سے اظہار محبت کے مروجہ طریقوں کو قرآن و حدیث کی کسوٹی پر پرکھیں اور پوری طرح صورتحال کا جائزہ لے کر اصلاح کی کوشش کریں۔ یہ بات ذہن نشین کر لی جائے کہ دنیا و آخرت کی فلاح و کامیابی کا دارومدار نئی نئی دعوں اور یہود و نصاریٰ کی رسومات بجالانے پر نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مکمل اطاعت اور صحابہ کرامؓ کے نقش قدم کی پیروی ہی پر ہے۔ اللہ تعالیٰ حق کو سمجھنے اور اس کی اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

بقیہ عالم طاغوت

اس مقصد کے لئے مخلصانہ کوشش ہونی چاہئے کہ اصلاح احوال کے تعلق سے یہ اس دور کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اب اور کوئی نبی آنے والا نہیں جو کسی نئی شریعت اور نئی کتاب کی تعلیم دے۔ گذشتہ زمانے میں طویل سلسلۂ نبوت چلتا رہا جو آج سے چودہ صدیاں قبل خاتم الانبیاء محمد ﷺ پر آکر ختم ہو چکا۔ زبان نبوتؐ سے اعلان ہو چکا کہ:

"میں آخری نبی ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں۔" (صحیح بخاری کتاب المناقب)

اور اللہ کی طرف سے خبردار کرنے والے نے یہ خبر بھی دے دی تھی کہ:

"ایمان والا شخص ایسی صورتحال سے دوچار ہو گا گویا اس نے ایمان نہیں آگ کا انگارہ مٹھی میں لے لیا ہو۔" (ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب الرقاق باب تغیر الناس)

ایسے میں عوام و خواص کو طاغوت کی نشاندہی کے ساتھ اس کا رد کرنے کی دعوت دینا اور قرآن و سنت کے سائے تلے آجانے کیلئے بلانا ہی اصل کام ہے۔ اگرچہ موجودہ عام نام نہاد مسلمان انفرادی اور اجتماعی طور پر طاغوت کو للکارنے اور اس کے ساتھ تصادم کی جرأت سے یکسر محروم ہیں۔ یہاں تک کہ اب تو طاغوت سے مدافعت کی ضروری صلاحیت بھی حوالۂ طاغوت کر چکے ہیں! پھر بھی ہم اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں۔ مایوس تو ابلیس ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تو اپنی کتاب میں خوشخبری دی ہے:

"کہو میرے ان بندوں سے جو اپنے آپ پر زیادتیاں کر چکے ہیں کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، بے شک تمہیں کہ اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ یقیناً وہ بخشنے والا مہربان ہے۔" (الزمر: ۵۳)

ہم تو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ توفیق اور اس کی تائید و نصرت کے سہارے اس کے آخری رسول ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے مطابق اعبدوا الله اور واجتنبوا الطاغوت کے مشن کو لے کر اٹھے ہیں۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے طاغیانہ رویہ اپنا کر خود کو خسران مبین میں ڈال دیا ہے، ان کے لئے بھی اللہ نے واپسی کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ ضرورت فقط اس امر کی ہے کہ کھل کر طواغیت کی نشاندہی کی جائے تاکہ راہ حق کے مسافر طاغوت کی ہر نوع سے اپنی گردنیں آزاد کرالیں اور پھر اس راہ میں یکسو ہو کر ساتھ دیں۔ دعوت کے مرحلے میں ثابت قدم رہ کر جہاد فی سبیل اللہ کیلئے خود کو تیار کریں۔

قارئین! ایمان باللہ کے مقابلے میں کُفر بالطاغوت کی اہمیت کے پیش نظر اس مسئلے پر قلم اٹھانا ضروری سمجھا گیا تاکہ دعوت کا یہ پہلو اس مشن کے حاملین پر پوری طرح واضح ہو جائے۔ دراصل مختلف قسم کے طواغیت سے محبت اور قلبی تعلق کے بجائے ان سے برأت و بیزاری اور مکمل کنارہ کشی ایمان باللہ اور یکسوئی کیلئے ناگزیر ہے۔ چنانچہ قرآن و حدیث کے معیار پر ان کی نشاندہی کیلئے تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ قلب سلیم رکھنے والوں کیلئے یہ ہدایت کا سبب بنے اور مالک حقیقی ہماری اس حقیر کوشش کو سعی مشکور کے زمرے میں شمار کر کے ہمیں اپنے ابرار بندوں میں شامل کر لے۔ آمین

بقیہ سید و سادات

عائشہ رضی اللہ عنہا کی طویل روایت ہجرت کے واقعے کے بارے میں ہے۔ ہجرت سے پہلے مسلمانوں کو بہت زیادہ تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ ابوبکرؓ ایک مرتبہ حبشہ ہجرت کر جانے کے ارادے سے نکلے اور برک الغماد کے مقام تک پہنچ گئے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ

فلقيه ابن الدغنه وهو سيد القارة فقال اين تريد

(صحیح بخاری کتاب الکفالۃ، باب جوار ابی بکر فی عہد رسول اللہ و عقدہ)

"انھیں وہاں اس وقت ہو کہ قارہ قبیلے کا سید (سردار) تھا اور ان سے پوچھا گیا کہاں جانے کا ارادہ ہے؟"

ابن قارہ کا قبیلہ قارہ تھا اور وہ اس قبیلے کا سید یعنی سردار تھا، پورا قبیلہ سید نہ تھا۔

آخر میں اسامہ بن زید کی روایت پیش خدمت ہے۔ بیان فرماتے ہیں کہ:

فلما غزا رسول الله ﷺ بدرا فقتل الله بها من قتل من صناديد الكفار وسادة قريش (صحیح بخاری کتاب الادب، باب کنیۃ المشرک)

"پھر جب رسول اللہ ﷺ نے غزوہ بدر کیا، تو اس میں قریش کے کئی کافر سید (سردار) قتل ہوئے۔"

معلوم ہوا کہ غزوہ بدر میں قتل ہونے والے کافروں میں کئی "سادۃ قریش" یعنی قریش کے سردار تھے، نہ کہ کسی سید قوم کے افراد تھے۔

ان دلائل سے واضح ہے کہ "سید" نام کا کوئی ایسا قبیلہ یا خاندان نہیں جو نام و نسب کی بنا پر دوسرے انسانوں پر برتری رکھتا ہو بلکہ یہ سردار اور قوم کے بڑے کے لئے استعمال ہونے والا ایک لفظ ہے چاہے وہ سردار کافر ہو یا مومن۔ سید ہونے کا دعویٰ کرنے والے بتائیں کہ سید خاندان شروع کس انسان سے ہوتا ہے؟ سب انسانوں کا نسب ایک ہی باپ یعنی آدم علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ چاہیے تو یہ کہ پھر سب ہی سید ہوں۔ اللہ سب انسانوں کا رب ہے۔ اس کی نگاہ میں سب انسان برابر ہیں۔ محض نام و نسب کی بنا پر کوئی بھی نجات نہیں پا سکتا۔ اور نہ ہی رشتہ و نسب آخرت میں کام آسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لن تنفعكم أرحامكم ولا أولادكم (الممتحنہ ۳)

"تمھارے رشتے دار اور تمھاری اولاد ہرگز تمھارے کام نہ آئے گی۔"

یہی بات نبی ﷺ نے واضح فرمائی ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

"اے بنی عبد مناف! اپنی جانوں کو اللہ سے خرید لو۔ اے زبیر بن عوام کی والدہ رسول کی پھوپھی! اے فاطمہ بنت محمد! اپنی جانوں کو اللہ سے خرید لو۔ میں تمھارے لئے اللہ کی بارگاہ میں کچھ کام نہیں آسکتا۔ تم میرے مال میں سے جتنا چاہو مانگ لو۔"

(صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب من انتسب الی آبائہ فی الاسلام والجاھلیۃ)

نوح علیہ السلام کے بیٹے، نوح و لوط علیہما السلام کی بیویاں، ابراہیم علیہ السلام کے والد، نبی ﷺ کے چچا ابولہب و ابوطالب، اور خود نبی ﷺ کے والد اللہ کی نافرمانی کے سبب گرفتار عذاب ہیں۔ اور انبیاء کے ساتھ خونی رشتے نے انھیں کچھ بھی فائدہ نہیں دیا اور نہ ہی یہ برگزیدہ انبیاء علیہم السلام ان کو اللہ کی پکڑ اور اس کے عذاب سے بچا سکے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ نبی ﷺ نے تو اپنے خاندان والوں کو صدقہ کھانے سے بھی منع فرما دیا تھا کہ کسی کو دین کے ذریعے کچھ وصول کرنے کا شبہ بھی نہ ہو۔ لیکن آج کے سید کہلانے والوں کا تو کام ہی جاہل لوگوں سے آل نبی ہونے کے دعوے کی بنا پر مال بٹورنا ہے۔ اللہ تعالیٰ جاہلیت کے ان کاموں اور باتوں سے سب مسلمانوں کو بچائے۔ آمین

نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا

نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا جو شخص اللہ کی مقرر کردہ حدود پر قائم ہے اور وہ جو ان سے تجاوز کرنے والا ہے، ان دونوں کی مثال ان لوگوں کی طرح ہے جو کسی کشتی میں قرعہ اندازی کر کے سوار ہوئے، بعض اس کے اوپر کے حصے میں تھے اور بعض اس کے نچلے حصے میں۔ جب نیچے والوں کو پانی کی ضرورت ہوتی تو وہ اپنے اوپر والے ساتھیوں کے پاس گئے۔ پھر انھوں نے آپس میں کہا کہ کیوں نہ ہم اپنے حصے میں ایک سوراخ کر کے (دریا میں) سے پانی حاصل کر لیں اور اپنے اوپر والوں کو اذیت نہ دیں۔ تو اگر اوپر والے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں اور انھیں ان کے ارادے سے باز نہ رکھیں تو سب کے سب ہلاک ہو جائیں، اور اگر انھیں روک دیں تو سارے کے سارے نجات پائیں۔ (صحیح بخاری کتاب الشرکۃ، باب ھل یقرع فی القسمۃ والاستھام فیہ)

کشتی والوں کی اس مثال کے ذریعے نبی ﷺ نے کتنے آسان اور موثر انداز میں امر بالمعروف اور نھی عن المنکر کی اہمیت کو واضح فرمایا ہے۔ اگر معاشرے میں پھیلی برائیوں کی نشاندہی کی جائے نہ ان کے سدباب کے لئے کوئی کوشش کی جائے بلکہ صرف اپنی ہی فکر کی جائے، دوسروں سے کوئی غرض نہ رکھی جائے اور عام طور سے بیان کئے جانے والے مقولے:

"اپنے مسلک کو چھوڑو نہیں اور دوسرے کے مسلک کو چھیڑو نہیں"

پر عمل کرتے ہوئے کسی برائی سے ہرگز کوئی تعرض نہ کیا جائے، اور جو جس کفر و شرک میں مبتلا اور بدعات پر عامل ہو اس کو اسی طرح رہنے دیا جائے، اس کے خلاف زبان و قلم کے استعمال کو "صلح کلی" اور "امن پسندی" کے خلاف جانا جائے، تو یاد رکھئے کہ پھر یہ ناؤ ڈوب جائے گی اور اس میں سوار ہر طرح کے مسافر بھی ڈوب جائیں گے، وہ بھی جو اس خرابی میں مبتلا تھے اور وہ بھی جو اس سے مجتنب تھے۔ تباہی کا دریا سب کو ایک ساتھ بہا کر لے جائے گا۔ اس لئے اس اجتماعی تباہی سے بچنے کے لئے نیکی کا حکم کرتے رہنے اور برائی سے روکنے کی اتنی ہی شدید ضرورت ہے جتنی شدت کے ساتھ ان معاشرتی خرابیوں میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ عمل بلاتوقف مسلسل جاری رہے کہ اسی میں ہر ایک کی نجات ہے۔ ورنہ ایسا نہ کیا گیا تو نادانوں کے ہاتھوں آنے والی خرابی سے دانا بھی نہ بچ سکیں گے۔ اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس طرح واضح فرمایا ہے کہ:

واتقوا فتنة لا تصيبن الذين ظلموا منكم خاصة (الانفال: ۲۵)

"اور اس فتنے سے ڈرو جس کی زد میں خصوصیت سے صرف ظالم لوگ ہی نہ آئیں گے۔"

انبیاءؑ کے ناخلف وارث

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَامِنْ نَبِیٍّ بَعَثَہُ اللّٰہُ فِیْ اُمَّةٍ قَبْلِیْ اِلَّا کَانَ لَہٗ مِنْ اُمَّتِہٖ حَوَارِیُّوْنَ وَاَصْحَابٌ یَّاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِہٖ وَیَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِہٖ ثُمَّ اِنَّھَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِھِمْ خُلُوْفٌ یَّقُوْلُوْنَ مَالَا یَفْعَلُوْنَ وَیَفْعَلُوْنَ مَالَا یُؤْمَرُوْنَ فَمَنْ جَاھَدَھُمْ بِیَدِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ وَّمَنْ جَاھَدَھُمْ بِلِسَانِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ وَّمَنْ جَاھَدَھُمْ بِقَلْبِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ وَّلَیْسَ وَرَآءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ ۔

عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ سے پہلے اللہ نے کسی اُمّت میں ایسا نبی نہیں بھیجا جس کی اُمّت میں ایسے حواری اور صحابی نہ ہوں جو اس کی سنّت پر چلتے ہوں اور اس کے حکم کی پیروی کرتے ہوں۔ پھر ایسے ناخلف لوگ ان کے بعد آتے رہے جو وہ باتیں کہتے جو کرتے نہ تھے اور کام وہ کرتے جن کا انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا۔ پس جس نے ان سے ہاتھ سے جہاد کیا تو وہ مومن ہے اور جس نے اُن سے زبان سے جہاد کیا تو وہ مومن ہے اور جس نے اُنہیں دل سے بُرا جانا تو وہ بھی مومن ہے اور اس کے بعد تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں

(صحیح مسلم: کتاب الایمان، باب کون النھی عن المنکر من الایمان .....)

غور کرنے کی بات

اللہ کے بندو! آج دنیا میں ایک قیامت بپا ہے، ہر طرف ناانصافی ہے، ظلم و جور ہے، کہیں سکون نہیں، کوئی عافیت کی جگہ نہیں۔ جانتے ہو کہ یہ فسادِ عظیم کیوں برپا ہوا ہے؟ یہ جو انسان درندہ بن گیا ہے اور انسانیت انگاروں پر لوٹ رہی ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ وجہ صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان نے اپنے مالک کے ساتھ کیا ہوا وعدہ پورا نہ کیا۔ احسان مندی کا حق ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ جس نے زمین کو بچھایا، اور آسمان کو بلند کیا، وہ جو صبح و شام کا مالک ہے، جس نے کائنات کو انسان کی خدمت میں لگا دیا، زمین اس کے لئے رزق اگلتی ہے، آسمان بارش برساتا ہے، ہواؤں سے اسے ٹھنڈک ملتی ہے، سورج گرمی پہنچانے کے لئے موجود ہے، مکان سکون حاصل کرنے کا ٹھکانہ ہے، گھر والوں سے دل بہلتا ہے، دولت کام بنانے کے لئے حاضر ہے۔ یہ سب کچھ جس کی کار فرمائی ہے، اس کے ساتھ انسان نے بلکہ قریب قریب پوری انسانیت نے احسان فراموشی کا رویہ اختیار کیا، اور وہ ہدایت، وہ رہنمائی جو اس کی طرف سے ملی تھی یکسر فراموش کر ڈالی۔ یہ اسی طرزِ عمل کا نتیجہ ہے کہ زندگیاں تلخ ہیں، آبرو باقی نہیں رہی، انصاف کا جنازہ اٹھ چکا ہے، ہر جگہ ایک بے کلی ہے، بے چینی ہے، حسرت و یاس ہے۔ اور سب سے بڑا غضب تو یہ ہے کہ مسلمان امت جس کو پروردگار نے اس لئے پیدا کیا تھا کہ وہ خیر کی داعی بنے، برائی سے لوگوں کو روکے اور اللہ کے رنگ میں رنگ کر یک رنگ ہو جائے، یک سو بن جائے، وہ تک اپنے مالک کو بھول چکی ہے۔ وہ جو زمین کے نمک تھے، جو پہاڑی کے چراغ بنائے گئے تھے، ان کا یہ حال ہو گیا ہے کہ آج ہر جگہ مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک اللہ کے باغی، اس کے نبی ﷺ کی سنت کو پسِ پشت ڈالنے والے، آخرت سے بے پروا اور خالی دنیا پر مگن ہیں۔ اب جب اس امت کا یہ حال ہو جائے، ان کا یہ عالم ہو جائے جو خیر کے ذمہ دار بنائے گئے تھے تو پھر دنیا کی بربادی پر تعجب کیوں ہو؟ آج یہ اللہ کی کتاب کے حامل، یہ ایمان دار کہلائے جانے والے، جو کبھی سرفراز و سرخرو تھے، کامران و سربلند تھے، ایک ایک خطہ میں مغلوب ہیں۔ ان کی آبروئیں پامال کی جاتی ہیں، ان کی بستیاں اجڑتی ہیں، ان کے نوجوانوں کو چھیدا جاتا ہے، ان کے گھروں کو آگ لگائی جاتی ہے، اور وہ سرگرداں ہیں، حیران و پریشان ہیں، کہاں جائیں کیا کریں۔ زمین ان کا بار اٹھانے سے انکاری ہے، اور آسمان ان پر سایہ کرنے سے گریزاں نظر آتا ہے۔ وہ جو کبھی امام تھے، آج مقتدی بننے کے لائق نہیں رہے۔ جو اللہ کو ایک مان لینے اور اس کے آخری نبی ﷺ کی سنت کو اختیار کر لینے کے بعد جہانبانی کے منصب پر فائز کئے گئے تھے، غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے کراہ رہے ہیں۔ لیکن خلاصی کی کوئی راہ نہیں پاتے۔ ہمتیں پست ہیں، ذہن پریشان، خون کی گرمی و حرارت باقی نہیں رہی۔ اپنی ذلت اور رسوائی پر، اپنی خرابی اور خستگی پر کڑھتے تو ہیں مگر مجبور ہیں۔ دنیا کہتی ہے کہ وہ جو اسلام تھا مٹ چکا۔ قومیں اٹھتی ہیں اور برباد ہو جاتی ہیں۔ نظریات وجود میں آتے ہیں اور موت کی نیند سو جایا کرتے ہیں۔ وہی عام قاعدہ اسلام پر بھی حق ثابت ہوا۔ اور یہ مسلمان جو کسی زمانے میں ابھرے تھے، ان کو بھی اسی سطح پر آنا پڑا جو اوروں کے لئے مقدر ہے۔ اور کیوں نہ کہیں جب پوری امت کا حال یہ ہے کہ اس کی زندگی اسلام سے دور اور ہر اس چیز سے قریب ہے جس کی جھوٹی چمک دمک اس کی آنکھوں کو خیرہ کر دے۔ کیسے یہ آواز نہ اٹھے کہ امت مسلمہ نام کی کوئی قابلِ ذکر امت اب پائی نہیں جاتی۔ جب خود اس امت کے فرزند اپنے دین سے بیگانہ اور دین ان کیلئے اجنبی بن گیا ہو......

(اقتباس: دعوت الی اللہ، صفحہ ۲، ۳)